ماہنامہ
نومبر 2023ء
طلوعِ اسلام
لاہور
اشاعت کا اِسی واں سال

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ (الحدیث)
حضرت محمد ﷺ کے بعد نبوت کا ہر دعویٰ باطل ہے



علامہ اقبالؒ کے ایماء اور قائداعظمؒ کی خواہش پر 1938ء سے شائع ہونے والا ماہنامہ

اس شمارے میں:

- لمعات: دانتے اور ابن عربیؒ کی فکر اور علامہ اقبالؒ کا "جاوید نامہ" 4
- دعلامہ غلام احمد پرویزؒ لندہ پیژندنہ/تعارف 12
- درسِ قرآن (سورۃ النسآء آیات 43 تا 48) 18
- متحرک نفسیات (تیسری قسط) 43
- قوم کے اعصاب کس نے کمزور کر دیئے؟ 52
- اللہ کے عالم خلق کے قوانین کی فہم کے لیے انسان کو عقلی صلاحیت 54



علامہ محمد اقبال

یومِ پیدائش (9 نومبر 1877ء)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

شرحِ جاوید نامہ شائع ہوگئی!

مفکرِ قرآن غلام احمد پرویز علیہ الرحمتہ کے لیکچرز کی تحریر پر مشتمل اپنے انداز کی منفرد شرح جاوید نامہ شائع ہوگئی ہے۔ بڑے سائز کے 800 صفحات پر مشتمل اِس یکتائے روزگار شرح کی قیمت صرف ایک ہزار روپے ہے۔ ''جاوید نامہ'' کیا ہے اس کے متعلق پرویز علیہ الرحمتہ کی زبانی خود ملاحظہ فرمائیے:۔

''علامہ اقبالؒ کی فارسی کی کتاب ہے ''جاوید نامہ''۔ اگر آپ نوجوانوں کو اسلام کی تعلیم دینا چاہتے ہیں تو میں یہ عرض کروں گا' مبالغے کی بات نہیں ہے' یہ ایک کتاب ''جاوید نامہ'' پڑھا دیجئے لیکن اس کے پڑھانے کے لیے ایسے لوگوں کی یا ایسے شخص کی ضرورت ہوگی جو علومِ حاضرہ کے اوپر پوری دسترس رکھتا ہو۔ یہ بڑی جامع کتاب ہے اور میں سمجھتا ہوں یہ اقبالؒ کی فکر کا شاہکار ہے۔ تاریخ عالم پہ نگاہ' مذاہبِ عالم پہ نگاہ' سارے فلسفے کے اوپر نگاہ' الٰہیات کے اوپر نگاہ' سوشیالوجی کے اوپر نگاہ' تمدن کے اوپر نگاہ' نظام کے اوپر نگاہ' سب سے بڑی یہ چیز کہ قرآن کی گہرائیوں کے اوپر بڑی نگاہ۔ اگر کہیں یہ چیز نصاب کی اس انداز سے سامنے آئے پھر آپ دیکھئے گا کہ انہی نوجوانوں کی ذہنیت کیسے بنتی ہے اور کیا بنتی ہے۔ یہ جو چیز ہے کہ کوئی دوسری قوم آئے گی۔ بڑا حسین انداز ہے۔ اقبال کے الفاظ ہیں وہ اس انداز سے بات شروع کرتا ہے کہ یہ نظام آیا تو ملوکیت بھی گئی اور یہ پاپائیت بھی گئی اور سرمایہ داری بھی گئی یہ سب چیزیں انہوں نے اُڑا دیں۔ میرے دل کے اندر جو بات چھپی ہوئی ہے آج میں اسے بے نقاب کہہ دینا چاہتا ہوں۔ الفاظ نہیں مل رہے یہ کہنے کے لیے کہ میں کیا کہوں کہ یہ قرآن ہے کیا' یہ کتاب تو نہیں کچھ اور ہی ہے۔ اس کی کیفیت یہ ہے کہ جب جان کے اندر کسی کے یہ اتر جاتی ہے تو جان بدل جاتی ہے اور جب جان بدل جاتی ہے تو دنیا بدل جاتی ہے''۔

(بحوالہ دروس القرآن سورۃ المائدہ آیات 51 تا 56)

اہم نوٹ: پی ٹی سی ایل کے لینڈ لائن نمبر صرف دفتری اوقات کے لیے ہیں۔ لینڈ لائن رابطہ نمبر خراب ہونے کی صورت میں یا چھٹی کے دن/وقت آپ سیل فون نمبر پر ٹیکسٹ/ وٹس ایپ میسیج کر سکتے ہیں۔

آپ سے درخواست ہے کہ اپنا مدعا تفصیلی طور پر ایک ہی میسیج میں لکھ دیجئے۔ شکریہ

منگوانے کا پتہ

ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) 25-بی، گلبرگ 2، لاہور۔ فون نمبرز: +92 42 3571 4546, +92 310 4800 818
+92 318 4271 465, +92 331 4763 936

ماہنامہ
طلوعِ اسلام لاہور
نومبر2023ء

جلد 76 شمارہ نمبر 11

اس شمارے میں

عنوان	مصنف	صفحہ نمبر
لمعات: دانتے اور ابن عربیؒ کی فکر اور علامہ اقبالؒ کا ''جاوید نامہ''	ادارہ	4
د علامه غلام احمد پرویزؒ لنډه پیژندنه / تعارف	داود مومند	12
درسِ قرآن (سورۃ النسآء' آیات 43 تا 48)	پرویز علیہ الرحمۃ	18
متحرک نفسیات (تیسری قسط)	راجہ عبدالعزیز' آزاد کشمیر	43
قوم کے اعصاب کس نے کمزور کر دیئے؟	ادارہ	52
اللہ کے عالم خلق کے قوانین کی فہم کے لیے انسان کو عقلی صلاحیت	ڈاکٹر انعام الحق' اسلام آباد	54

چیئرمین: خورشید انور

مجلسِ ادارت
ڈاکٹر انعام الحق' ڈاکٹر اعجاز رسول
اقبال ادریس ایڈووکیٹ

مدیر انتظامی: محمد سلیم اختر

قانونی مشیر: ملک محمد سلیم ایڈووکیٹ

ادارہ کا مضمون نگار کی تحریر سے کُلّی اتفاق ضروری نہیں۔

زرِتعاون: 50 روپے فی پرچہ
پاکستان: 600 روپے سالانہ
رجسٹرڈ ڈاک: 1000 روپے سالانہ

ادارہ طلوعِ اسلام B-25 گلبرگ 2، لاہور 54660، (پاکستان)
Phone: 042-35714546
Cell: +92 310-4800818
idarati@gmail.com www.facebook.com/Talueislam

Bank Account Idara Tolu-e-Islam
National Bank of Pakistan, Main Market Branch Gulbarg Lahore

For Domestic Transactions
Bank A/C No: 0465004073177672

For International Transactions
IBAN:PK36NBPA0465004073177672
Swift Code: NBPAPKKAA02L

ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صَرف کی جاتی ہے

ناشر: عرفان راٹھور اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز سے چھپوا کر B-25، گلبرگ II لاہور سے شائع کیا

طلوعِ اسلام

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
کوئی اندازہ کرسکتا ہے اُس کے زورِ بازو کا!
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں
ولایت، پادشاہی، علم اشیا کی جہاں گیری
یہ سب کیا ہیں، فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں
براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے
ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنالیتی ہے تصویریں
تمیزِ بندہ و آقا فسادِ آدمیّت ہے
حذر اے چیرہ دستاں! سخت ہیں فطرت کی تعزیریں
حقیقت ایک ہے ہر شے کی، خاکی ہو کہ نوری ہو
لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرّے کا دل چیریں
یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

چہ باید مرد را طبع بلندے، مشرب نابے
دلِ گرمے، نگاہِ پاک بینے، جانِ بیتابے

(بانگِ درا۔ علامہ اقبالؒ)

(جاری ہے)

ادارہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

دانتے اور ابن عربیؒ کی فکر اور علامہ اقبالؒ کا "جاوید نامہ"

اقبالؒ نے غالباً یہ تصور دانتے سے نہیں بلکہ ابن عربیؒ سے مستعار لیا ہوگا کیونکہ ابن عربیؒ پر اس کی نظر تھی۔ اس خیال اور اس طریقہ کار کے تابع انہوں نے ایک معراج نامہ لکھنا چاہا اور اس کا نام معراج نامہ نہیں رکھا کیونکہ اقبالؒ کو ذاتِ رسالت ﷺ سے اتنا عشق تھا کہ ان کی غالباً یہ خواہش رہی کہ اپنے تصورات کو معراج سے تعبیر کریں۔ اس لیے انہوںؒ نے اس کا نام "جاوید نامہ" رکھا ہے لیکن طریقہ کار اس کا بھی وہی ہے۔ فرق یہ ہے کہ اقبالؒ اسے اپنی اندرونی واردات (INNER EXPERIENCES) کہہ کر نہیں بیان کرتا بلکہ وہ اپنی علمی کیفیات کو بروئے کار لاتا ہے۔ اقبالؒ اسے اپنے علم کی اُن بلندیوں پر لے گیا ہے کہ میرے نزدیک اگر علمی اعتبار سے یہ پرکھنا ہو کہ اقبالؒ کتنا اونچا تھا' تو "جاوید نامہ" دیکھنا چاہیے۔ اس کے علم کی کیفیت یہ ہے کہ وہ "بدھ اور بروٹ" فلاسفر کے زمانے سے ابتدا کرتا ہوا آج تک کی دنیا کے ہر خطے میں گزرنے والے ہر مذہب سے وابستہ بڑے لوگوں کے نقطۂ نظر سے بحث کرتا چلا جاتا ہے۔ اقبالؒ ہر مکتبہ فکر کے نظریات' ان کا فلسفۂ عقیدہ' مذہب کی تفصیل' کچھ اس وضاحت سے پیش کرتا ہے کہ انسان سینکڑوں کتابوں سے مستغنی ہو جاتا ہے۔

اقبالؒ کی شاعری میں ایمائیت ایک مشکل مرحلہ ہے

اب یہاں ایک مشکل یہ ہے کہ وہ جس سے ملاقات کرتا ہے' اس سے SUGGESTIONS (تراغیب و اشاریات) کی بات کرتا ہے' جو شاعری میں ہے اور SUGGESTIVENESS (ایمائیت) کے اندر ہے۔ وہ تو بس اشارہ کر کے آگے بڑھ جاتا ہے لیکن جب تک آپ کو اس پر عبور نہ ہو کہ اس کا فلسفہ کیا ہے' یہ کیا کہہ گیا ہے' اس وقت تک وہ مصرع سمجھ میں نہیں آتا۔ اگر آپ "جاوید نامہ" کو یوں پڑھیں کہ اس میں بیان کردہ باتیں آپکی نظر میں پہلے سے موجود نہ ہوں اور آپ کو ان کا علم ہو جائے تو آپ سوچیے کہ اس کتاب کو ختم کرنے کے بعد وہ کیا کچھ نہیں' جو آپ کے سامنے نہ آ جائے۔ یہ اقبالؒ کا طریقہ کار ہے۔

پیرِ رومی (مولانا جلال الدین رومیؒ) کو یہ اپنا مرشد کیوں بنا رہا ہے؟ اس لیے کہ رومی کی شاعری کے اندر توانائی ہے اور

اقبالؒ کو توانائی بڑی پسند تھی۔ اسے یہ پیرومرشد بناتا ہے۔ بجائے اس کے کہ وہ ستاروں کا نام لیتا' یہ ان ستاروں میں گیا۔ یہ چھ ستاروں [1] کے اندر جاتا ہے۔ یہ ہمارے نظام شمسی کے سات میں سے چھ ستاروں میں جاتا ہے اور انہیں فلک کہہ کر پکارتا ہے۔ اس کے بعد یہ ''آں سوئے افلاک'' چلا جاتا ہے۔ ''آں سوئے افلاک'' وہ مقام ہے جہاں یہ رومیؒ اور دانتے (DANTE) کو بھی پیچھے چھوڑ کر اکیلا آگے جاتا ہے۔ میں نے کہا ہے کہ اکیلا گیا تھا۔ اس نے وہاں سے تصور (IDEA) نہیں لیا۔ معراج کی روایات میں ایک مقام پر پہنچ کر جبریل کہتا ہے کہ اگر اس مقام پہ ایک قدم بھی میں آگے بڑھا تو ''فروغِ تجلیٔ بسوزد پراں'' میرے پر جل جائیں گے' میں اس سے آگے نہیں جاسکتا۔

علامہ اقبالؒ کے نزدیک ''زمان ومکاں'' ایک بنیادی موضوع کی حیثیت رکھتا ہے

حضور نبی اکرم ﷺ جب آگے تشریف لے گئے' حضور ﷺ تو تنہا گئے ہیں' اقبالؒ بھی وہاں سب کچھ چھوڑ کر تنہا آگے جاتا ہے اور واپس آکر یہ مشاہدات ایسے انداز میں بیان کر گیا ہے جو اس کی کسی دوسری کتاب میں نہیں ملتے۔ ابتدا ہی میں' میں یہ عرض کر دوں کہ اس کا جو بنیادی موضوع (BASIC THEME) ہے' وہ ہے جی! فلاسفی آف ٹائم' یعنی زمان کا فلسفہ' زمان کا ہی نہیں بلکہ زمان و مکاں (TIME & SPACE) دونوں کہیے۔ زمان اور مکان کا فلسفہ اساسی (BASIC) فلسفہ ہے۔ اصل میں اس فلسفہ کو ہمارے زمانے میں برگسان (1859-1941ء) نے بڑی اہمیت دی ہے۔ اقبالؒ اس کو بڑا (APPRECIATE) (پسند) کرتا ہے۔ اقبالؒ سے پیشتر ہمارے حکما نے بھی ٹائم (زمان) کے اس فلسفہ کو تنقیدی طور پر بیان (DISCUSS) کیا ہے۔ امام اشعری نے سب سے پہلے اس پر غور کیا لیکن اس پر سب سے زیادہ اہم تحقیق رومیؒ کی ہے۔ اقبالؒ نے ان کا مطالعہ کیا اور موضوع کو آگے بڑھایا۔

زمان ومکاں کے تصورات کی اہمیت اور تصوف کی دنیا

آپ یہ کہیں گے کہ وقت کا فلسفہ کیا ہے؟ یعنی یہ ہے کیا؟ وقت کے متعلق ہمیں یہی پتا ہے کہ مثلاً اتنے بجے ہیں اور بس! لیکن جب یہ بات فلسفے میں پہنچتی ہے تو بڑی اہم ہوجاتی ہے۔ سارے تصوف کی بنیاد زمان و مکاں (TIME & SPACE) کے فلسفہ پر ہے۔ ایک ٹائم یا زمان یا زمانہ تو وہ ہے جسے ہم COMMON SENSE (فہمِ عامہ) کہتے ہیں' یعنی ہمیں پتا ہے کہ صبح ہوتی ہے' شام ہوتی ہے۔ وقت کی مثال تسبیح کے دانوں سے دی جاتی ہے یعنی یہ جو واقعات (EVENTS) ہیں' یہ اس کے دانے ہیں اور جو اس کے اندر تاگا ہے' یہ ٹائم ہے۔ اس تاگے میں یہ دانے ایک ایک کر کے گرتے ہیں۔ اقبالؒ نے بھی اپنے ہاں ''ارمغانِ حجاز'' میں ریگِ رواں کی یہی تشبیہ دی ہے کہ وہ صراحی میں سے ایک ایک قطرہ نیچے گرتا ہے یعنی

---

[1] وہ یہ ہیں: فلکِ قمر' فلکِ عطارد' فلکِ زہرہ' فلکِ مریخ' فلکِ مشتری اور فلکِ زحل

میری صراحی سے قطرہ قطرہ نئے حوادث ٹپک رہے ہیں۔

وہ یہ ہے جس کی مثال دی ہے ۔واقعات کو یہ یوں کہتے ہیں۔ اب دو واقعات کے درمیان ایک بُعد' فاصلہ (INTERVAL)رہ جاتا ہے' خلارہ جاتا ہے۔اقبالؒ کہتے ہیں کہ اس میں PURE TIME(مطلق زماں) ہوتا ہے' کئی واقعات ہوتے ہیں۔ PURE TIME(مطلق زماں) کہہ کر مجھے ذرا یوں لگا کہ ہم فلاسفی کی طرف آنے لگے ہیں ۔انکے بقول یہ وقت ہے جس کا ہمیں یوں شعور ہوتا ہے کہ صبح ہوئی' شام ہوئی' دو بجے' چار بجے یا اکبر فلاں سال میں آیا' اس کے بعد جہانگیر آیا۔ یہ تمام واقعات' EVENTS(حوادث) ہیں' جو اس وقت میں بظاہر ظہور پذیر ہوتے ہیں اور ان کی اصطلاح میں یہ SERIAL TIME(سلسلہ وار زمانہ) کہلاتا ہے۔

اقبالؒ کی نظر میں زمان و مکاں دو بڑی اہم چیزیں ہیں۔ یہ سیریل ٹائم عام شعور (CONSCIOUSNESS) کی سطح پر ہوتا ہے۔اس کے لیے فلسفے کی اصطلاح ہے کہ

SERIAL TIME IS CONTINUUM FOR THE EFFECTIVE SELF

(سلسلہ وار زمانہ' کارگر ذات کے لیے' سلسلہ ہائے تسلسل کی مانند ہے)۔

یہ اس ذات (SELF) یا شعور (CONSCIOUSNESS) کے دو حصے کرتے ہیں : کارگر اور قدر افزا (i) EFFECTIVE & (ii) APPRECIATIVE)۔ان میں کارگر (EFFECTIVE) وہ ہوتا ہے جسے ہم عام طور پر شعور (CONSCIOUSNESS) کہتے ہیں۔عمومی طور پر اصطلاح میں اسے سیریل ٹائم کہتے ہیں۔ برگسان (1859-1941ء) نے کہا تھا کہ جسے ہم سیریل ٹائم کہتے ہیں' یہ زماں کے گز پر گرہوں کے نشان لگے ہوئے ہیں جو ہم نے صرف پیمائش (MEASURE) کرنے کے لیے لگا رکھے ہیں ورنہ ان کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

مکان (SPACE) کے متعلق بھی ان کا یہ کہنا ہے کہ اگر دو چیزیں ہمارے سامنے کھڑی ہوں تو اضافی طور پر (RELATIVELY)ان کے درمیان جو فاصلہ ہوتا ہے' ہم اس کو تو ماپ سکتے ہیں' وہ SPACE(مکان) تو ہمارے سامنے ہوتی ہے۔اور اگر چیزیں نہ ہوں' یا یہ ایک چیز ہے اور دوسرا اس کے آگے کچھ نہیں ہے' تو وہ کہتے ہیں کہ اس طرح سے تم مکان کو ذہن میں بھی نہیں لا سکتے۔مکان تو اس وقت ہمارے ذہن میں آتا ہے' جب دو مادی چیزیں ' CONCRETE THINGS(محسوس چیزیں) اس طرح رکھی ہوں کہ ایک کے بعد دوسری ہو' حتیٰ کہ وہ رکھی ہوئی بھی اس طرح سے ہوں کہ اگر ایک کے سامنے دوسری ایک لائن میں ایسے رکھی ہوئی ہے اور ہم اس پہلی کے پیچھے کھڑے دیکھ رہے ہیں تو وہ دوسری چیز ہمیں نظر نہیں آئے گی۔اور اگر وہ ذرا سی اونچی ہے' نظر بھی آ رہی ہے تو درمیان میں مکاں نظر نہیں آئے گا۔

شعور کی سطح سے ہٹ کر زمان ومکاں کے وجود کی نوعیت

اگر شعور کی سطح مختلف ہوجائے تو صبح اور شام' رات اور دن' مہینے اور سال' سب' ختم ہوجاتے ہیں۔ بالکل ایسے ہی جیسے حالتِ نیند میں یہ سب ختم ہوگئے ہوئے ہوتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ حالت نیند میں چونکہ کوئی دوسرا شعور ہوتا ہی نہیں' اس لیے اس وقت ہمیں زمان (TIME) کا احساس نہیں ہوتا۔ اگر شعور اس طرح سے بدلے کہ یہ سیریل ٹائم (سلسلہ وار زمانہ) نکل جائے' تو اس ٹائم کا نام ان کے نزدیک DURATIONLESS TIME (بلا مدت زمانہ) ہے۔ وہ DURATIONLESS TIME (بلا مدت زمانہ) آئے یا جو یہ مکاں (SPACE) ہے یا جو ہم نے اضافی چیزیں کہا ہے' یہ نکل جائیں' اور جسے ہم ABSTRACT SPACE (غیر محسوس مکاں) کہتے ہیں' وہ آجائے' تو وہ کہتے ہیں کہ پھر یہاں سے لے کر عرش تک کچھ فاصلہ نہیں رہتا اور نہ ہی یہ چیز رہتی ہے کہ صاحب! اتنے وقت حضور ﷺ گئے اور اتنے میں واپس آگئے۔ وہ جو کہتے ہیں کہ آپ ﷺ گئے تھے' کنڈی ہل رہی تھی' واپس آئے تو ابھی ہل رہی تھی' وہ یہی ہے۔ وہ چیز یہ ہے کہ شعور کے بدل جانے سے زمان ومکان کا جو تصور ہے' وہ اس تصور سے مختلف ہوجاتا ہے' جو شعور کی سطح سے پرے ہوتا ہے۔ اس لیے ہمیں سمجھانے کی خاطر روایت کو استعمال کرکے بتایا جاتا ہے کہ ایک ہی ثانیہ کے اندر حضور ﷺ اتنا کچھ طے کرکے واپس بھی آئے' تو اس میں زمان (TIME) نہیں رہتا' یہ لمبائی یا فاصلہ (SPACE) نہیں رہتا' یہ سب وہیں کے وہیں ہوتے ہیں۔ شعور کی تبدیلی سے TIME & SPACE (زمان اور مکان) کا' یہ CONCRETE AND ABSTRACT (محسوس اور بسیط) سیریل بدل کر' زمان ومکان بلا زمان وبُعد (DURATIONLESS & DISTANCELESS) رہ جاتے ہیں۔ اقبالؒ اس کے متعلق یہ کہتا ہے کہ

از شعور است ایں کہ گوئی نزد و دُور

تُو یہ جو نزدیک اور دُور کی بات کرتا ہے' تو یہ شعور کی وجہ سے ہے

چیست معراج؟ انقلاب اندر شعور

معراج کیا ہے؟ یہ شعور کے اندر ایک انقلاب ہے۔

تصوف میں معراج کا مفہوم

یہ جو شعور کے اندر انقلاب ہے' اس کے متعلق اہل تصوف کہتے ہیں کہ یہ تصوف کی ریاضتیں اور مراقبے ایک عمل (PROCESS) ہے' جس سے شعور میں اس قسم کا انقلاب آجاتا ہے ''زماں اور مکاں'' کا بُعد کم ہونا شروع ہوجاتا ہے اور کم ہوتے ہوتے پھر اس مقام پہ پہنچ جاتا ہے جہاں نہ صبح وشام کی کوئی تمیز رہتی ہے' نہ نزد اور دُور کا کوئی فرق باقی رہتا ہے۔ وقت' بلا دورانیہ (TIME DURATIONLESS) ہوجاتا ہے اور مکاں سمٹ جاتا ہے۔ اور وہاں پہنچنے کے بعد اس کا

آخری منتہا ھُوَ الۡاَوَّلُ وَالۡاٰخِرُ وَالظَّاھِرُ وَالۡبَاطِنُ ۚ [1] (57:3) ہوتا ہے۔ اول و آخر یوں ہے کہ زمان کے لحاظ سے وہ بلا مدت (DURATIONLESS) اور ظاہر و باطن مکاں کے اعتبار سے بلا فاصلہ (DISTANCELESS) ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ ہے انتہائی مقام' جو خدا کو حاصل ہے۔

جب انسان اپنے اندر خدائی شعور بیدار کرتا چلا جاتا ہے' تو زمان و مکان کی اضافی اصطلاحات (RELATIVE TERMS) واضح ہونے لگتی ہیں اور یہ مطلق (ABSOLUTE) چیزیں اس کی دسترس میں آنے لگتی ہیں' پھر اس کی کیفیت ایسے ہوجاتی ہے کہ وہ بیٹھے ہوئے آنے والے ہزار سال کے واقعات کو اپنے سامنے دیکھ لیتا ہے کیوں کہ آنے والا ہزار سال ان کے لیے ہے' جن کے شعور کی سطح ابھی سلسلہ وار زمانہ میں ہے۔ جب وہ سیریل ٹائم سے اونچا چلا جاتا ہے تو جس طرح خدا کے سامنے نہ کوئی شے اول ہے' نہ آخر' نہ PAST ہے' نہ PRESENT' نہ FUTURE ہے' جسے اقبالؒ ابدال آباد حالتِ موجودہ (ETERNAL NOW) کہتا ہے۔ وہ خدا کے سامنے موجودہ حالت ہے۔ اسی طرح جو انسان اپنے اندر ایسی شعوری تبدیلی پیدا کر لیتا ہے' اس کے لیے بھی ٹائم کی حدود اور مکاں کی حدیں ہٹتی چلی جاتی ہیں۔ لہٰذا ہماری روایات میں جو یہ مشہور ہے کہ حضرت صاحب یہاں' اور نماز مکے میں ادا کی تو اس کی وجہ یہ شعوری تبدیلی ہے۔ تم اس لیے نہیں مانتے کہ اس فاصلے کو شعور (CONSCIOUSNESS) کی سطح سے ماپتے ہو یا کہا جاتا ہے کہ کسی حضرت نے آنے والے واقعات کی آگاہی دی' تو تمہارے نزدیک وہ مستقبل (FUTURE) ہے' ان کے نزدیک وہ حال' موجودہ حالت (NOW) ہے' کیوں کہ وہ اس شعوری سطح پر پہنچ گیا ہے جہاں یہ ماضی' حال اور مستقبل (PAST, PRESENT & FUTURE) کا سلسلہ وار زمانہ (SERIAL TIME) ختم ہوجاتا ہے اور ایک حال (NOW) اس کے سامنے ہوتا ہے اس لیے قیامت تک کے واقعات اس کے سامنے آجاتے ہیں۔ یہ ہے اقبالؒ کے نزدیک معراج کا بنیادی موضوع (THEME) اور یہ ہے اس کے نزدیک تصوف کی بنیاد۔

اقبالؒ اس تصور پر چلتا ہے۔ یہ انقلاب اندر شعور ہے۔ اور شعور کے بدلنے سے وہ یہ کہتا ہے کہ زمان و مکاں کے تصورات (CONCEPTS) بالکل مختلف ہوجاتے ہیں۔ لہٰذا جو باتیں تم اپنے موجودہ تصور (CONCEPT) کے ماتحت ناممکن قرار دیتے ہو' اُس تصور کے ماتحت وہ ممکن ہوجاتی ہیں۔ میں نے اس طریقے سے اقبالؒ کا فلسفہ سمجھایا ہے' جس کی بنیاد پر یہ ''معراج'' ہمارے روایتی موضوعات ''جاوید نامہ'' اور ''تصوف'' کی عمارت استوار کرتا ہے مگر قرآنی نکتۂ نگاہ سے یہ

---

[1] اس کی ذات' زمان و مکاں کی نسبتوں سے ماورا ہے۔ سب سے اول بھی وہی ہے اور سب سے آخری بھی وہی۔ اُس کے لیے نہ ابتدا ہے' نہ انتہا۔ وہ ہر شے پر غالب ہے لیکن اس کا غلبہ غیر مرئی اور غیر محسوس طور پر کام کرتا ہے (قانون ہوتا ہی غیر مرئی اور غیر محسوس ہے) لیکن اس کے نتائج محسوس اور مرئی ہوتے ہیں۔ یا یوں سمجھو کہ جملہ کائنات' اس کی صفاتِ خالقیّت و ربوبیّت کی مظہر اور اس کی ہستی کی زندہ شہادت ہے' لیکن اس کی ذات' انسانی نگاہوں سے پنہاں اور مستور ہے۔ اس اعتبار سے وہ باہمہ بھی ہے اور بے ہمہ بھی۔ الٰہیات کی اصطلاح میں یوں کہا جائے گا کہ وہ TRANSCENDENT بھی ہے اور IMMANENT بھی (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص ص۔ 1275, 1276 نیز فٹ نوٹ 1)۔

سب کچھ افسانوی باتیں ہیں۔

زمان و مکاں کے سلسلہ میں قرآنِ حکیم کی راہنمائی اور نمودِ صالحیت

قرآن مجید اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ (3:190) کو آیات اللہ قرار دیتا ہے' وہ اس فرق کو مٹا کر کبھی آیات اللہ قرار نہیں دیتا۔ لیل و نہار کے اس فرق کو وہ تاریخ میں سلسلہ وار زمانہ کہتا ہے مثلاً حضرت نوحؑ آئے' حضرت نوحؑ کے بعد حضرت ابراہیمؑ آئے' حضرت ابراہیمؑ کے بعد حضرت محمد ﷺ آئے۔ ان زمانوں میں جو وقت (TIME) اور بُعد (DISTANCE) کا فرق ہے' وہ اس کو برقرار رکھ رہا ہے۔ خدا بھی ہمارے لیے اس تمام فرق کو' اس زمان و مکاں (TIME & SPACE) کو' اسی طرح رکھتا ہے جس طرح وہ سلسلہ ہمارے سامنے آتا ہے یا ہمارے شعور کی سطح پر آتا ہے' دوسرے شعور کا تو اس میں کوئی ذکر ہی نہیں ہے۔ اور اگر یہ کوئی چیز تھی تو نبیؐ کے ساتھ تو یہ ہو سکتی تھی' ان کی واردات میں ہم قطعاً شریک نہیں ہو سکتے' کوئی غیر از نبی شریک نہیں ہو سکتا۔ باقی جو کچھ بھی ہے' جسے آپ انقلاب اندر شعور کہتے ہیں' وہ انسان کے قلب (MIND) کی کوئی صلاحیتیں (FACULTIES) ہیں' خبر نہیں ابھی کتنی ہیں' ان کے متعلق تو علمی طور پر ابھی تحقیق ہی نہیں ہو سکی ہے' جب تحقیق ہو گی' تو اس کے متعلق ہم سمجھ لیں گے کہ انسان کی قلبی صلاحیتیں (MENTAL FACULTIES) پیدا ہو کر ان لوگوں سے مختلف ہو جاتی ہیں جن کی ہنوز پیدا نہیں ہوتیں۔ اتنی سی چیز تو ہمارے روزمرہ کے مشاہدے میں ہے کہ بڑے سے بڑا ریاضی کا سوال جس کو ہم کھیت کنارے کھڑے ہو کر' ایک منٹ میں بتا دیتے ہیں وہ بے چارہ کسان ہے جو 5 بار 20 ہوئے پھر 6 بار اور اس کے سات 20 ہوئے تو وہ پھر بھول جاتا ہے۔ یہ ذرا سا فرق روزمرہ کی زندگی میں ہمیں نظر آ جاتا ہے۔

قرآنِ حکیم موجودہ زندگی کے شعور کے علاوہ کسی دوسرے شعور کو متعارف ہی نہیں کراتا

قرآن حکیم ہماری موجودہ زندگی کی صلاحیتوں کو جلا قرار دیتا ہے۔ قرآن حکیم اس کے علاوہ کسی دوسرے شعور کا اس صفحۂ ارض پہ ذکر ہی نہیں کرتا۔ وہ آخر میں جا کر شعوری سطح کو بدل کر بیان کرتا ہے۔ وہاں کہتا ہے کہ جب وہ اٹھیں گے تو پوچھیں گے کہ ہم وہاں کتنا عرصہ رہے؟ کوئی کہے گا کہ صاحب! کچھ دن رہے' کوئی کہے گا کہ دن کا کچھ حصہ رہے اور پھر وہ کہیں گے کہ اُس سے پوچھو' جس کو حساب یاد ہو۔ وہ یہ کہے گا کہ صاحب! ہم علمِ خداوندی میں رہے۔ یعنی موجودہ شعوری حالت باقی رہے گی' سب کچھ یاد ہوتا ہے' پہچان بھی ہوتی ہے لیکن وہاں ٹائم (زمان) کا تصور (CONCEPT)' قرآن حکیم کے مطابق موجودہ تصور کے ماتحت نہیں ہوتا۔ جس طرح خدا کا ایک ایک دن' پچاس پچاس ہزار سال (70:4) یا ہزار ہزار سال (32:5) کا ہوتا ہے' مِمَّا تَعُدُّوْنَ (22:47) تم گنتی کرتے ہو۔ یہ تمہارے تصور سے جسے تم پچاس ہزار سال (70:4) کہتے ہو' خدا کے نزدیک تو یہ ایک آن ہوتی ہے یا ایک دن ہوتا ہے (22:47; 32:5; 70:4)۔ تو اس میں تصور کا فرق ہے۔

قرآنِ حکیم کی بیان کردہ جنتِ ارضی کا تصور اور قلبی صلاحیتوں کی اہمیت

اس صفحۂ ارض کے بعد کی زندگی میں جو ٹائم کا تصور ہے' میں سمجھتا ہوں کہ اس میں مکاں کا تصور بھی شامل ہے۔ موجودہ

شعور میں ہر دو کیفیات کے اندر وہ تبدیلی تو بتاتا ہے کیوں کہ جنت کے متعلق وہ کہتا ہے کہ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ۙ (57:21)(اس کی وسعت' زمین و آسمان کو محیط ہے) اور وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ ۙ (3:133) جنت کی جو ارض ہے' وہ سماوات والارض ہے۔ اگر سماوات والارض ساری جنت ہے تو پھر جہنم کہاں ہے؟ یہ ''کہاں ہے'' کا سوال پیدا ہوا جب ہم ان کو مقامات تصور کریں۔ ہمارے موجودہ شعور کے اعتبار سے اگر یہ ساری جنت ہے تو جہنم کہیں نہیں ہوسکتی' اگر کہیں جہنم ہے تو ساری جنت نہیں ہوسکتی لیکن جب مکاں کا یہ تصور بدل جائے گا تو پھر آپ کے گمان کی تصویر کچھ اور ہو جائے گی لیکن قرآن کریم بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ہم نے صرف مثال دے کر بات سمجھائی ہے' کوئی آنکھ محسوس نہیں کرسکتی کہ اس کی ٹھنڈک کے سامان ہم نے کیا رکھے ہیں۔ جب کوئی آنکھ اس سطحِ ارض پر ابھی اس کا احساس نہیں کرسکتی تو اس صفحۂ ارض کے اوپر شعور میں جو اقبالؒ اتنی تبدیلی بتا رہے ہیں' اس کا امکان نہیں ہوسکتا ہے۔ اس لیے یہ جو کچھ بھی ہے' انسان کی اپنی قوتِ ارادی ہے' جو قلب (MIND) کی صلاحیتیں ہیں' جو قلبی قوتیں (MENTAL FORCES) ہیں' یہ ان کی نشوونما (DEVELOPMENT) ہے' جس کا تعلق دین سے کچھ نہیں ہے' روحانیت سے کچھ نہیں ہے' خدا سے کچھ نہیں ہے' رسول سے کچھ نہیں ہے' جس کا جی چاہے' وہ یہ کچھ کرسکتا ہے۔ مشرک بت کے سامنے کر لیتا ہے' آپ خدا کے سامنے کر لیتے ہیں۔ اس میں نہ شرک و توحید کا فرق ہے' نہ کفر و اسلام کا فرق ہے۔ یہ ایک مزاح ہے (IT IS ONLY A FUN)' یہ ایک قیاس ہے اور ہر فن کی طرح اسے بھی پیدا کیا جاسکتا ہے۔

انقلابِ شعور کے سلسلہ میں علامہ پرویزؒ کا ذاتی تجربہ اور قرآنِ کریم کی روشنی میں تجزیہ

یہ ہے وہ چیز جو میں قرآن کریم سے سمجھا ہوں جس کو یہ سارے ''انقلاب اندر شعور'' کہتے ہیں' کسی نہ کسی حد تک وہ سب کچھ مجھے بھی حاصل تھا[1]۔ اور جب یہ دیکھ لیا کہ یہ سب کچھ' صرف اپنے ہی قلب کی کچھ صلاحیتیں (FACULTIES) تھیں جو پیدا ہوئی تھیں اور ان سے وہ کچھ ہو جاتا ہے جنہیں وہ کرامتیں کہتے ہیں اور جن سے یہ سرزد نہیں ہوتیں ان کی صلاحیت DEVELOP نہیں ہوئی ہوتی ورنہ اس کے علاوہ ایسی صورت نہیں کہ شعور کی یہ تبدیلی' وہ تبدیلی ہے جسے ہم خدا کی طرف منسوب کردیں کہ اس کے نزدیک نہ اول اور آخر میں کوئی فرق ہے' نہ ظاہر اور باطن میں کوئی فرق ہے۔ قرآن کریم تو کہتا ہے کہ: وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ ؕ (57:4)(تم جہاں بھی ہو' وہ تمہارے ساتھ ہے)۔ یہ صرف خدا کے لیے کہا جاسکتا ہے۔ اس قسم کے مکاں کے اندر جو بلا بُعد (DISTANCELESS) ہو جانا ہے تو یہ هُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ ؕ (57:4) صرف خدا کی ذات کے لیے ہے' اس کے علاوہ اس صفحۂ ارض کے اوپر' یہ شعوری تبدیلی نہیں ہوسکتی۔

انسان کی طبعی زندگی کے بعد قلبی صلاحیتوں کی نشوونما اور خاصۂ نبوت

ہم آج نہیں کہہ سکتے کہ مرنے کے بعد شعور کیا ہوگا؟ یہاں جس چیز کو زیرِ بحث لایا جاتا ہے وہ سوائے اس کے کچھ نہیں

[1] یہاں پرویزؒ (1903-1985) کا اشارہ اپنے اس دور کی طرف ہے جس میں ان کی ابتدائی زندگی تصوف کی وادیوں میں بسر کرتے ہوئے چلّوں اور مراقبوں کی نذر ہوگئی۔

کہ انسان کے اپنے ہی قلب یا قلبی صلاحیتوں کی نشوونما ہے۔ اس نشوونما سے طبعی تبدیلی پیدا ہوتی ہے' اس سے زیادہ اس کی کوئی حیثیت نہیں جبکہ نبوت ایک قطعاً الگ شے ہے' ہم اس کو سمجھ (CONCEIVE) ہی نہیں کر سکتے۔ اس ''نبوت'' میں جو کچھ تھا' وہ تھا' لیکن چونکہ وہ ختم ہوگئی لہٰذا اس کے متعلق اب بحث وتمحیص نہیں ہوسکتی کہ کیا اب یہ کسی اور کے لیے ممکن (POSSIBLE) ہے یا نہیں؟ کیوں کہ جب وہ خاصۂ نبوت ہے اور نبوت ختم ہوگئی تو اس کے امکانات وممکنات وہیں ختم ہوگئے۔ اس کے علاوہ جو کچھ ہے اس کا تعلق ان چیزوں سے نہیں ہے جن کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ اس میں مقداری (QUANTITATIVE) فرق ہے' کمیت کا فرق نہیں ہے یا یہ کہ یہ صرف نوعیت کا (QUALITATIVE) فرق ہے۔ یہ سراسر مختلف کیفیت ہے' درجے کا فرق نہیں ہے۔ حقیقت میں نبوت اس سے یکسر ایک الگ خصوصیت ہے۔

نبوت ایک یکسر الگ خصوصیت ہے

تصوف وطریقت والے ڈگری (درجے) کا فرق بتاتے ہیں کہ نبی کے شعور میں جو تبدیلی ہوتی ہے' وہ ڈگری (درجے) کے اعتبار سے بہت اونچی ہوتی ہے اور اس کے بعد ان میں جو تبدیلیاں ہوتی ہیں' وہ ہوتی تو انہی شقوں کی ہیں لیکن وہ ذرا کم درجے کی ہوتی ہیں۔ یہ بات قطعاً غلط ہے۔ نبوت کی کوئی درجہ بندی نہیں ہوسکتی' اس میں ڈگری (درجے) کا فرق ہی نہیں ہوسکتا' مقداری فرق بھی نہیں ہوسکتا کیونکہ نبوت ایک یکسر الگ خصوصیت تھی' جو ختم ہوگئی' اس خاتمہ کے بعد اس میں سے کسی کو کچھ بھی نہیں مل سکتا' اس کے حصے بھی نہیں ہوسکتے۔ نبوت کے برعکس یہ قلب کی صلاحیتیں ہیں جو آگے جاتی ہیں' انہی کی نشوونما کی جاسکتی ہے۔ اس لیے بقول ان کے اس کا تعلق روحانیت [1] سے ہوتا ہے۔

علامہ اقبالؒ کی ''مناجات'' کے موضوع کو اگر سمجھ لیا جائے تو ''جاوید نامہ'' سمجھ میں آجاتا ہے:

اسے ذہن نشین کر لیجیے کہ روحانیت کا لفظ قرآن حمید میں نہیں ہے۔ یہ ہے وہ ساری چیز جو قابلِ غور ہے لیکن معراج کی جو مروجہ بنیاد ہے' اس کی رو سے اس کا نام ''جاوید نامہ'' کیوں نہ رکھ دیا جائے کیونکہ اس میں یہ سب کچھ موجود ہے۔ ''انقلاب اندر شعور'' جس میں زمان ومکاں کا تصور ہے' مختلف ہوجاتا ہے اور اقبالؒ اس کی بنیادوں پر چلتا ہے۔ اقبالؒ نے ''جاوید نامہ'' کی پہلی مناجات ہی میں اس بات کو واضح کر دیا ہے' کتاب کا سارا موضوع اس میں آ گیا ہے۔ اور وہ یہی ہے جو میں نے ابھی آپ کے سامنے پیش کیا ہے۔ اس کو سمجھ لیا جائے تو ''جاوید نامہ'' سمجھ میں آجائے گا۔ اگر اس بنیاد کو نہ سمجھا جائے تو پھر ''جاوید نامہ'' کی پہلی مناجات ہی سمجھ میں نہیں آتی۔ (ماخوذ ''شرح جاوید نامہ'' از غلام احمد پرویزؒ۔ صفحہ: 6 تا 14)

---

[1] اپنے مطالعہ اور عملی تجارب سے میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ جو کچھ ''روحانیت'' کے نام سے پکارا جاتا ہے' وہ ایک فن ہے۔ جس طرح جسمانی کسرت سے انسان کی طبعی قوتوں میں ناقابلِ یقین حد تک اضافہ ہوجاتا ہے' اُسی طرح اِس قسم کی ذہنی مشقوں سے انسان کی قوتِ ارادی اور تخیل میں ایسا اضافہ ہوجاتا ہے' جس کا عام حالات میں تصور تک نہیں کیا جاسکتا۔ چونکہ جسمانی قوت کا مشاہدہ محسوس طور پر ہوسکتا ہے' اس لیے اسے کوئی فوق الفطرت تصور نہیں کرتا لیکن قوتِ ارادی غیر محسوس اور غیر مرئی ہوتی ہے' اس لیے اس کے مظاہر فوق الفطرت سمجھے جاتے ہیں۔ جو قومیں علمی میدانوں میں آگے بڑھ گئی ہیں' وہ اس حقیقت سے واقف ہوگئی ہیں۔ جہاں ہنوز توہم پرستی کا دور دورہ ہے' وہاں اسے ''روحانیت'' سے تعبیر کیا جاتا ہے

(پرویزؒ: تصوف کی حقیقت' طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ لاہور' 1992' ص۔م)۔

داود مومند

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

د علامه غلام احمد پرویز علیه رحمه

لنډه پیژندنه / تعارف

علامه غلام احمد پرویز د شلمې پیړۍ عظیم مفکر ، مدبر ، معلم قرآن ، ممتاز سکالر ، جینئس ، صاحب طرز ادیب ، مایه ناز انشاء پرداز اؤ همه جهت شخصیت وؤ ، د علامه پرویز صاحب پیدایش د جولایۍ په نهمه نېټه کال ۱۹۰۳ کښې د مشرقي پنجاب ضلع ګرداس پور بټاله نومې ښار کښې شوے وؤ ، د پلار نوم ئې فضل دین اؤ د نیکه نوم ئې مولوي رحیم بخش وؤ ، چې د هاغه وخت ډېر جید عالم ، صوفي بابا ، حکیم (طبیب) او د سنسکرت ژبې عالم وؤ ، د علامه صاحب ابتدائي تعلیم و تربیت خپل نیکه کړے وؤ ، په کال ۱۹۲۱ء کښې د تعلیم په سلسله کښې لاهور ته راغلو ، خو خپل نیکه ورته تاکید کړے وؤ چې د دوو کسانو سره ضرور ملاویږه ، په دې کښې یو علامه اقبال هم وؤ ، په کال ۱۹۲۱ء کښې ئې اولنی ملاقات علامه اقبال سره وکړو ، علامه اقبال نه ئې د قرآن فهمې اسلوب زده کړو ، چې دا په محاوره عرب اؤ تصریف آیات باندې مبني وؤ ، علامه صاحب اولنی ملازمت په سوپرډنټ آفس لاهور کښې کړے وؤ ، بیا ریاست ممدوټ (موجود بهارتي پنجاب) ته لاړو هلته ئې هم څه وخت ملازمت وکړو ، بیا علامه صاحب د پبلک سروس کمېشن امتحان ورکړو ، چې په ډېر ښه پوزېشن سره ئې پاس کړو ، او په کال ۱۹۲۷ء د حکومت هند مرکزي سیکرټریټ هوم ډیپارټمنټ استبلشمنټ ډویژن کښې برتي

شو ، او بیا ئې په کال ۱۹۵۵ء کښې قبل از وخت پنشن واخستو او خپل ټول عمر ئې قرآني مشن ته وقف کړو ۔

د علامه پرویز قلمي سفر :

علامه صاحب د قلمي سفر آغاز د کال ۱۹۲۸ء نه کړے وۀ ، هاغه وخت کښې به ئې په مختلفو موضوعاتو لیکل کول چې بیا په مختلفو رسالو اؤ مجلو کښې به شائع کېدل ، لکه دارالامصنفین ، ماهنامه معارف د اعظم ګړهـ ، په حیدر آباد دکن کښې ترجمان القرآن وغیره ، کله چې د علامه صاحب مضامین په دې رسالو کښې شائع کېدل شروع شو ، نو ډېر مقبولیت ئې حاصل کړو ، په دې دوران کښې د علامه صاحب ژوند د علمي معرکه آرائیو نه عبارت وۀ ، په کال ۱۹۳۲ء کښې کله چې د مولانا ابو الکلام ازاد د تفسیر " ترجمان القرآن " ړومبی جلد شائع شو ، چې په سورت فاتحه کښې ئې د خپلې نظرئې تبلیغ ډېر په صراحت سره کړے وۀ : دۀ وئیل چې عالمګیر سچائۍ د دنیا په هر مذهب کښې یو شان دي ځکه ټول مذاهب رښتیني دي : د علامه پرویز صاحب د بصیرت قرآني مطابق دا نظریه د اسلام جړې له بېخه اوباسي ، د علامه صاحب په نېز دا د برهمو سماج تعلیم خو کېدے شي ، مګر د قرآن نه ، ځکه علامه صاحب د دې نظرئې تردید اوکړو او د دې په رد کښې ئې یوه تفصیلي مقاله ولیکله ، چې په ماهنامه معارف (اعظم ګړهـ) کښې په کال ۱۹۳۳ء کښې شائع شوه ، ابو الکلام ازاد په دغه وخت کښې ډېر مقبول وۀ ، د زبان و بیان بادشاه اؤ د علم سمندر ګڼلے شو ، مګر د علامه صاحب جرت ایماني وۀ ، چې په دغه وخت کښې په دغسې مقبول شخصیت باندې علمي نقد اوکړو ، اؤ د دۀ په تفسیر ئې خپل اولنی نقد شائع کړو ۔

په کال ۱۹۲۶ء کښې د ریاست بهاولپور په عدالت کښې یوې مسلمانې ښځې دعویٰ دائر کړه ، چې زما خاوند قادیاني مسلک اختیار کولو سره مرتد شوې دے ، لهذا دې کس سره دې د مدعیې نکاح فسخ کړلے شي ، دا مقدمه تقریباً نهه کاله

جاري وه ، بالآخر محمد اکبر مرحوم ډسټرکټ جج بهاولنګر په اوومه فروري کال ۱۹۳۵ء کښې د دې مقدمې فیصله واوروله ، دا فیصله د علامه صاحب یو مضمون " میکانکي اسلام " کښې ضمناً د نبي د تعریف په بنیاد واورولې شوه ، فاضل جج په خپلې فیصلې کښې په وضاحت سره د علامه صاحب ذکر کړے وۂ ، دۂ وئیل چې ماته د ټولو نه غوره د نبي تعریف د چوهدری غلام احمد پرویز صاحب ښکاره شو ، دا رنګ د قادیانیانو د غیر مسلم ګرځولو علمي بنیاد هم علامه پرویز ایښې دے ، علامه صاحب په دې موضوع باندې په کال ۱۹۷۴ء کښې یو کتاب " ختم نبوت اور تحریک احمدیت " هم شائع کړے دے۔

د رساله طلوع اسلام د دور جدید اجراء

علامه پرویز د علامه اقبال په وینا باندې د رساله طلوع اسلام د دور جدید اجرا په کال ۱۹۳۸ء کښې د اپریل میاشتې نه اوکړه ، مخکښې دا رساله د سید نذیر نیازي په زیر ادارت کښې شائع کیده ، خو بیا روستو دا رساله د علامه پرویز په زیر نګرانۍ کښې شائع کیدل شورع شوۂ ، د دې رسالې تسلسل د مئې د میاشت کال ۱۹۴۲ء پورې جاري وۂ ،چې بیا د څه وجوهاتو له کبله د ځنډ ښکار شوه ، بیا د قیام پاکستان نه پس دجنورۍ میاشت کال ۱۹۴۸ء کښې د دې رسالې دوباره شائع کیدل شورع شوۂ ، هغه وخت نه واخله چې تر ننه پورې ئې د اشاعت تسلسل لا جاري دے -

سلسله د معارف القرآن د علامه پرویز

علامه صاحب د سلسلۂ معارف القرآن ابتدا د کال ۱۹۴۱ء نه کړې وه ، د ړومبي جلد نوم " الله " ۂ ، چې بیا روستو د " من و یزداں " په نوم شائع شو ، د دویم جلد نوم " ابلیس و آدم " ۂ ، چې په دې کښې آدم ، ابلیس ، جن ، شیطان ، وحي ، رسالت وغیره عنواناتو باندې قرآني تصریحات پېش کړی شوې دي ، د سلسله معارف القرآن دریم جلد "جوئے نور" څلورم جلد " برق طور " پنځم جلد "

شعلۀ مستور " په دې درې جلدونو کښې د حضرت نوح ع نه تر حضرت عيسیٰ ع پورې د انبياوو کرامو د ژوند حالات بيان کړې شوې دي ، علامه صاحب بيا د نبي ص په سيرت باندې د " معراج انسانيت " په نوم کتاب شائع کړو ، بيا د وحي ضرورت اؤ اهميت ښکاره کولو د پاره ئې د دوه نيم زره کله فکری کوششونو نچوړ " انسان ـنے کيا سوچا " په عنوان سره کتاب شائع کړو ، د دې کتاب دويم جلد د وحي په آئينه کښې د انساني مسائلو حل څه دے، " اسلام کيا ھے " په عنوان سره ئې شائع کړو ، معاشي مسئله د هر دور يو اهمه مسئله ګڼلے شي ، په دغه وخت کښې د معاشي نظرياتو په بنياد دنيا په دوو بلاکونو کښې تقسيم وه ، د دې مسئلې قرآني حل پېش کولو لپاره علامه صاحب متعدد تقارير اؤ مضامين شائع کړه ، چې په دې کښې څه په " خدا اور سرمايه دار " نومې کتاب کښې شائع شو ، دې نه علاوه په دې مسئلې يو بل مبسوط تصنيف د " نظام ربوبيت " په نوم شائع کړے شو ، د صدو نه د تقدير مسئله د پيچدګۍ ښکار وه ، د دې مسئلې د حل لپاره علامه صاحب " کتاب التقدير " مرتب کړو ، د اخرت متعلق قرآني توضيحات ئې په " جهان فردا " نومې کتاب کښې شائع کړه ، داسې تقريباً څلويښت کاله عرصه کښې سلسله د معارف القرآن سر ته ورسيدله ۔

د علامه پروېز مختلف کتابونه

سلسله د معارف القرآن نه علاوه هم د علامه صاحب بې شماره کتابونه دي لکه " لغات القرآن " څلور جلده " مفهوم القرآن " دوه جلده " تبويب القرآن " دوه جلده ، داسې تفسير " مطالب الفرقان " اووه جلده ، داسې د علامه صاحب مکمل درس قران په تحريري شکل کښې هم په يو څلويښت جلده کښې شائع شوے دے ، دې نه علاوه د علامه صاحب نور هم ډېر ګڼ کتابونه دي لکه ، (۱) سليم کے نام خطوط " درې جلده ، (۲) طاهره کے نام خطوط ، (۳) اسلامي معاشرت (روزمره کے متعلق قرآنی احکام) ، (۴) اقبال اور قران " دوه جلده ، (۵) مجلس اقبال اول (

شرح مثنوی و اسرار و رموزے خودی) ، (۶) مجلس اقبال دوم (شرح مثنوی پس چه باید کرد) ، (۷) حسن کردار کا نقش تابنده (قائد اعظم) ، (۸) قائد اعظم کے تصور کا پاکستان (مجموعه مقالات و خطبات) ، (۹) سلسبیل (مجموعه مقالات و خطبات) ، (۱۰) فردوس گم گشته (مجموعه مقالات و خطبات) ، (۱۱) بهار نو (مجموعه مقالات و خطبات) ، (۱۲) تصوف کی حقیقت ، (۱۳) شاہکار رسالت (سیرت فاروق اعظم) ، (۱۴) مذاہب عالم کی آسمانی کتابیں ، (۱۵) جہاد (جہاد کے متعلق قرآنی احکامات) ،(۱۶) جہان فردا ، (۱۷) قرآني فیصلی " دوه جلده ، (۱۸) قراني قوانین ، (۱۹) اسباب زوال امت ، (۲۰) ختم نبوت اور تحریک احمدیت ، (۲۱) مقام حدیث ، (۲۲) شرح جاوید نامه ، وغیره دي اؤ یو کتاب ئی په انګریزی ژبه کښې هم شائع شوے دے Islam a challenge to religion ۔

لغات القرآن د علامه پرویز

علامه احد امین مصري په خپل کتاب " فجر السلام " کښې لیکلي دي ، چې د نورو اقوامو تصورات څنګه په مسلمانانو باندې په رو رو اثر انداز کېدۀ ، اؤ د دې په نتیجه کښې د قرآني تصوراتو په ځاے د نورو قومونو تصوراتو ځاے ونیوو ، هغه وائي چې نن مذهب اسلام څه ته وائي نو هغه مجموعه ده د مختلفو قومونو د مستعار تصوراتو ، چې په دې باندې د قرآني اصطلاحاتو لیبل لګولے شوې دے ، د دې تصوراتو د اثر نه نور خو څه ! چې عربي ژبه هم پاتې نه شوه ، اوس ضرورت د دې خبرې وۀ چې د قرآني الفاظو یو داسې لغت مرتب کړے شي ، چې په دې کښې نۀ صرف د الفاظو معنې بیان کړے شي ، کومې چې په زمانه د نزول قرآن کښې رائج وې ، بلکې د دې الفاظو په پس منظر کښې دې د قرآني تصوراتو وضاحت هم وکړی شي ، دا کار د یواځې کس نۀ وۀ ، بلکې د یو اداري اؤ جماعت وۀ ، لیکن علامه پرویز صاحب د همت او حوصلې بایللو واله شخص نۀ وۀ ، اؤ دا لوې کار ئې په یواځې ځان ترسره کړو ، علامه صاحب په څلور جلده کښې یو داسې لغت " لغات القرآن "

تیار کړو ، چې علامه صاحب د دې په تیارولو کښې د خپل قراني بصیرت نه علاوه تقریباً د پنځوس عربي لغتونو حوالې ورکړي دي ۔

د علامه پرویز د قرآن کریم د تدریس لړۍ او وفات

علامه صاحب د درس قرآن آغاز د دور ملازمت د وخت نه کړے وۂ ، دهلي ، شمله کښې به ئې په مختلف موضوعاتو درس ورکولو ، خو د قیام پاکستان نه پس چې کله دهلي نه کراچۍ ته راغلو ، نو دلته د کراچۍ نپیئر ۍ ریکس نومې ځاے کښې چرته چې د علامه صاحب کور وۂ ، د سوال و جواب نشست به کېدو ، چې روستو دې نشست د هفته وار درس قرآن شکل اختیار کړو ، دلته به داسې مسلسل ترتیب وار درس نه وۂ ، بلکې داسې په خاص خاص موضوعاتو به درس کېدو ، دا سلسله تر کال ۱۹۵۸ء پورې جاري وه ، علامه صاحب بیا په کال ۱۹۵۸ء کښې کراچۍ نه لاهور ته منتقل شو ، اؤ د درس دا سلسله ئې د خپل کور ۲۵ بي کلبرک لاهور نه شروع کړه ، ابتدائي درسونو کښې به داسې موضوعات زیر بحث وۂ ، چې د اسلام بنیادي تصورات اؤ اصطلاحات دي ، چې په دې پوهېدلو نه بغیر د قران تفهیم نۂ شو اسانېدلے ، لاهور نه د اول باقاعده درس قرآن آغاز د ستمبر میاشت کال ۱۹۶۰ء نه وشو ، اؤ تقریبا څه د پاسه اووه کاله دا درس جاري وۂ ، اؤ په ۳۱ دسمبر کال ۱۹۶۷ء کښې دا درس سر ته ورسیدو ، بیا د دور اول د درس اوریدونکو په اصرار باندې د درس دویم دور د ۱۷ مارچ کال ۱۹۶۸ء نه دوباره شروع شو چې تر ۲۵ اکتوبر کال ۱۹۸۴ء پورې د دې درس تسلسل جاري وۂ ، د سورة المطففین آیات ۲۶ ته درس رارسېدلی وۂ ، چې علامه صاحب بیمار شو ، چې بیا د اوږدې ناروغۍ له کبله په ۲۴ فروري کال ۱۹۸۵ء کښې د اتوار په ورځ ماښام تقریباً د دوه اتیا کالو په عمر کښې وفات شو ، اؤ د کلبرک (لاهور) په هدیره کښې خاورو ته وسپارلې شو ۔

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ۝ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ۝

پرویز علیہ الرحمۃ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۃ النسآء، آیات 43 تا 48

درسِ قرآن

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَقۡرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنۡتُمۡ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعۡلَمُوۡا مَا تَقُوۡلُوۡنَ وَلَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِیۡ سَبِیۡلٍ حَتّٰى تَغۡتَسِلُوۡا ؕ وَاِنۡ كُنۡتُمۡ مَّرۡضٰۤى اَوۡ عَلٰى سَفَرٍ اَوۡ جَآءَ اَحَدٌ مِّنۡكُمۡ مِّنَ الۡغَآئِطِ اَوۡ لٰمَسۡتُمُ النِّسَآءَ فَلَمۡ تَجِدُوۡا مَآءً فَتَیَمَّمُوۡا صَعِیۡدًا طَیِّبًا فَامۡسَحُوۡا بِوُجُوۡهِكُمۡ وَاَیۡدِیۡكُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا غَفُوۡرًا ﴿۴۳﴾ اَلَمۡ تَرَ اِلَى الَّذِیۡنَ اُوۡتُوۡا نَصِیۡبًا مِّنَ الۡكِتٰبِ یَشۡتَرُوۡنَ الضَّلٰلَةَ وَیُرِیۡدُوۡنَ اَنۡ تَضِلُّوا السَّبِیۡلَ ﴿۴۴﴾ وَاللّٰهُ اَعۡلَمُ بِاَعۡدَآئِكُمۡ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَلِیًّا ۙ وَّكَفٰى بِاللّٰهِ نَصِیۡرًا ﴿۴۵﴾ مِنَ الَّذِیۡنَ هَادُوۡا یُحَرِّفُوۡنَ الۡكَلِمَ عَنۡ مَّوَاضِعِهٖ وَیَقُوۡلُوۡنَ سَمِعۡنَا وَعَصَیۡنَا وَاسۡمَعۡ غَیۡرَ مُسۡمَعٍ وَّرَاعِنَا لَیًّۢا بِاَلۡسِنَتِهِمۡ وَطَعۡنًا فِی الدِّیۡنِ ؕ وَلَوۡ اَنَّهُمۡ قَالُوۡا سَمِعۡنَا وَاَطَعۡنَا وَاسۡمَعۡ وَانۡظُرۡنَا لَكَانَ خَیۡرًا لَّهُمۡ وَاَقۡوَمَ ۙ وَلٰكِنۡ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفۡرِهِمۡ فَلَا یُؤۡمِنُوۡنَ اِلَّا قَلِیۡلًا ﴿۴۶﴾ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡكِتٰبَ اٰمِنُوۡا بِمَا نَزَّلۡنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمۡ مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ نَّطۡمِسَ وُجُوۡهًا فَنَرُدَّهَا عَلٰۤى اَدۡبَارِهَاۤ اَوۡ نَلۡعَنَهُمۡ كَمَا لَعَنَّاۤ اَصۡحٰبَ السَّبۡتِ ؕ وَكَانَ اَمۡرُ اللّٰهِ مَفۡعُوۡلًا ﴿۴۷﴾ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغۡفِرُ اَنۡ یُّشۡرَكَ بِهٖ وَیَغۡفِرُ مَا دُوۡنَ ذٰلِكَ لِمَنۡ یَّشَآءُ ۚ وَمَنۡ یُّشۡرِكۡ بِاللّٰهِ فَقَدِ افۡتَرٰۤى اِثۡمًا عَظِیۡمًا ﴿۴۸﴾

عزیزانِ من! آج ستمبر 1970ء کی 13 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ النسآء کی 43 ویں آیت سے ہوتا ہے: (4:43)۔

مذہب انفرادیت کا خوگر، جب کہ دینِ نوعِ انسانی کے اجتماعی نظام کا علمبردار، نیز دین و مذہب میں صلوٰۃ کے اجتماعات

سابقہ آیات میں اس نظام کا ذکر تھا جو اس انقلابِ عظیم کے نتیجے میں قائم ہونا تھا، جس کی دعوت حضورِ نبی اکرم ﷺ دیتے چلے آ رہے تھے اور جس کا نقطۂ ماسکہ وہ تھا کہ اطاعت صرف خدا کے، اکیلے خدا کے، احکام و قوانین کی ہو سکتی ہے، اس

کے سوا کسی اور کی اطاعت جائز نہیں ہے۔ یہ نظام ایک اجتماعی زندگی چاہتا ہے۔ ہر نظام اجتماعی زندگی چاہتا ہے۔ مذہب اور دین میں بنیادی فرق یہ ہے کہ مذہب یکسر انفرادی شے ہوتا ہے جس میں ہر فرد اپنے اپنے طور پر گیان دھیان اور پوجا پاٹ کی ان چیزوں سے اپنی نجات کی فکر کرتا ہے لیکن دین ایک اجتماعی نظام کا نام ہے جس میں ہر وہ قوت جو انسانیت کے راستے میں رکاوٹ بن کر کھڑی ہو' اسے ہٹایا جاتا ہے اور پوری نوعِ انسانی کی فلاح و بہبود اور ترقی کے لیے کوشش کی جاتی ہے۔ اور دین چونکہ اجتماعی نظام کا نام ہے اس لیے اس میں اجتماعات نہایت ضروری ہیں' اس کی بنیادی چیز ہی اجتماعات ہیں اور یہ جو دین کے اجتماعات ہیں' انہیں صلوٰۃ کے اجتماع سے تعبیر کیا گیا ہے' جس کے معنی ہوتے ہیں: ''مسلسل اور پیہم کسی کا اتباع کرتے چلے جانا' کسی کے پیچھے پیچھے چلتے جانا''۔

عزیزانِ من! یہ صلوٰۃ کے جو اجتماعات ہیں انہیں اسلامی معاشرے کے قیام و استحکام کے لیے بنیادی اہمیت حاصل ہے لیکن مذہب میں آ کر تو یہ صرف پرستش اور بندگی کی چیز ہیں جو ہمارے ہاں عبادت کا غلط مفہوم ذہن میں لاتے ہیں۔ انفرادی طور پر مذہب میں تو ان کی یہ حیثیت ہے لیکن دین میں ان اجتماعات کی بڑی اہمیت ہے۔ یہ اس لیے منعقد کیے جاتے ہیں کہ سب سے پہلے اس چیز کا اقرار' یا اعتراف کیا جائے کہ ہم جھکیں گے تو صرف ایک خدا کے قانون کے سامنے جھکیں گے' دنیا کی کسی طاقت کے سامنے ہمارا سر نہیں جھکے گا۔ یہ ہے وہ عملاً اعتراف اور وہ اعلان جو آپ کے ہاں صلوٰۃ میں کبھی رکوع اور کبھی سجود کی شکل میں محسوس طور پر سامنے آتا ہے لیکن یہ عملِ محسوس ایک روح کا مظہر ہے اور وہ روح یہ ہے کہ جھکنا خدا کے علاوہ کسی اور کے سامنے جائز نہیں ہے۔ دل میں ان آرزوؤں کا بیدار کرنا' ان کے بے ساختہ اظہار کے لیے ان محسوس حرکات کا عمل میں آنا اور اس اقرار و اعتراف اور دل کے جھکاؤ اور آمادگی کے بعد پھر اگلی بات یہ ہے جس کی تمہید میں' میں نے عرض کیا ہے کہ مذہب میں یہی تمہید مقصود بالذات بن جاتی ہے یعنی اتنا ہی کچھ ہوتا ہے۔

اب ہمارے ہاں نماز میں حتیٰ کہ مسجد میں دنیا کی کوئی بات بھی نہیں کی جا سکتی۔ آپ کے ہاں دنیا اور دین میں اس قدر ثنویت یا Dualism ہی نہیں بلکہ تفاوت ہو گیا ہے کہ مسجد میں دنیا کی کوئی بات نہیں کی جا سکتی۔ اور جس نے صلوٰۃ کے یہ اجتماعات فرض قرار دیئے تھے' جس نے ان اجتماعات کو نظام کا رکن بنایا تھا' اس نے یہ کہا تھا کہ: وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ (42:38) جماعتِ مومنین کے لوگ اپنے خدا کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے نظامِ ربوبیت کے قیام کے مقصد کے لیے آگے بڑھتے ہیں' اس کے قوانین کی اطاعت کرتے ہیں وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ (42:38) نظامِ صلوٰۃ کا قیام کرتے ہیں' اس کی اقامت کرتے ہیں' اسے قائم کرتے ہیں۔

یہ اجتماعاتِ صلوٰۃ اسی نظامِ صلوٰۃ ہی کا ایک حصہ ہیں۔ یہاں مذہب میں تو یہ ہے کہ جب نماز پوری ہو جاتی ہے تو اس کے بعد آپ گھروں کو آ جاتے ہیں۔ آپ دیکھیے کہ دین میں یہ اجتماعات ایک آنے والے مقصد کے لیے تمہید ہے اور وہ مقصد کیا ہے؟ یہ کہ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ۪ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ۪ (42:38) وہ نظامِ صلوٰۃ انہیں یہ سکھاتا ہے کہ تمام امور کے

فیصلے قوانینِ خداوندی کی حدود میں رہتے ہوئے باہمی مشاورت سے طے ہونے ہیں۔ یہ اجتماعات تو معاملات کو باہمی مشاورت سے طے کرنے کے لیے تھے جن کا آغاز اور تمہید اس اعتراف اور اعلان کے ساتھ ہوتا تھا کہ ہم اطاعت اس کے قوانین کی کریں گے اور اس کے علاوہ کسی اور کی نہیں کریں گے۔ قرآنِ حکیم نے شروع میں ہی کہا ہے کہ اِیَّاکَ نَعۡبُدُ (1:4) ہم تیرے سوا کسی اور کی محکومیت اختیار نہیں کریں گے۔ یہ کتنا بڑا اعلان ہے!

عزیزانِ من! یہ بڑا ہی انقلاب آفریں اعلان ہے کہ 'ہم تیرے سوا کسی اور کی محکومیت اختیار نہیں کریں گے'۔ اور اس اقرار کے بعد جو مشاورت ہوگی تو ظاہر ہے کہ وہ اسی محور کے گرد گھومے گی' وہ انہی حدود کے اندر رہے گی۔ اب اگلا سوال یہ ہے کہ باہمی طور پر سوچا کیا جائے گا؟ سوچا یہ جائے گا کہ وہ کیا عملی طریقے اختیار کیے جائیں کہ دنیا میں سب سے پہلے ہماری کیفیت یہ ہو کہ ہم اس کے قوانین کے علاوہ کسی اور کی محکومیت اختیار نہ کریں اور اس کے بعد آہستہ آہستہ اس دعوت کو ایسے آگے بڑھائیں کہ پھر کوئی انسان نہ کسی دوسرے انسان کا محکوم رہے' نہ محتاج رہے۔ یہ ہیں وہ عملی طریقے جن کو باہمی مشاورت سے طے کرنے کے لیے یہ اجتماعاتِ صلوٰۃ منعقد ہوتے تھے۔

عہدِ رسالت ﷺ میں مسجدِ نبوی کا استعمال عدالت کے فرائض کی انجام دہی اور بطور کمیونٹی سنٹر کے بھی تھا

آج کے گئے گزرے زمانے میں بھی' جہاں تک وعظ کا تعلق ہے' وہاں ہمیں یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ اسی مسجدِ نبوی ﷺ کے اندر عدالت قائم ہوتی تھی' وہی آپ کی سیکرٹیریٹ تھی' وہیں باہر کی مملکتوں کے سفیر آتے تھے' وہیں مقدمات کے فیصلے ہوتے تھے' وہیں ایک گوشے میں مہمانوں کو ٹھہرایا جاتا تھا اور یہاں تک بھی ہمیں بتایا جاتا ہے کہ وہ جو حبشیوں کا ناچ ہوا تھا' وہ بھی صحنِ مسجد میں ہوا تھا۔ آپ ﷺ کے ہاں تو مسجد ایک ایسا کمیونٹی سنٹر تھا' جو ملت سے متعلقہ تمام امور کے حل کرنے کے لیے ایک اجتماعی نظام کا مرکز قرار پایا تھا۔ اس کو مسجد کہتے تھے۔ جس مسجد میں آج دنیا کی کوئی بات بھی کرنا جائز نہ رہا اس لیے کہ جو تمہید تھی وہ مقصود بالذات ہوگئی اور وہ بھی ایک رسم سے آگے نہ بڑھی۔ اب صورت حال یہ ہے کہ جب بھی کسی کو پیچھے سے آواز آتی ہے کہ تیری نماز نہیں ہوئی تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ تیرے ہاتھ یہاں کان کی لو کو نہیں چھوئے' تیرے ہاتھ سینے پہ نہیں بندھے تھے یا زیرِ ناف نہیں باندھے گئے' تیرے پاؤں میں اتنا فاصلہ نہیں تھا' سجدے میں جسم کا فلاں فلاں حصہ زمین کے اوپر نہیں لگا تھا' یہ چیزیں اس میں ہونگی کہ جس سے نماز نہیں ہوئی اور جو ان ارکان کو اس طرح سے پورا کردے اس کی نماز ہوگئی۔ یہ ہو کیا گیا؟ اسے کوئی نہیں پوچھتا۔

قرآن کریم نے کہا ہے کہ وَاَمۡرُهُمۡ شُوۡرٰى بَيۡنَهُمۡ ۖ وَمِمَّا رَزَقۡنٰهُمۡ يُنۡفِقُوۡنَ (42:38) اجتماعاتِ صلوٰۃ کا یہ مقصد تھا کہ باہمی معاملات باہمی مشاورت سے طے ہونے ہیں' اور یہ بھی تھا کہ رزقِ خداوندی کو اِس طریق سے بانٹا جائے

کہ دنیا میں کوئی ایک بھی بھوکا باقی نہ رہے۔ اس مقصد کے لیے آپ کا یہ نظامِ صلوٰۃ تھا اور صلوٰۃ کے یہ اجتماعات تھے۔ بہرحال یہ چیز تو شروع میں بھی' جب الصلوٰۃ آئی تھی تو میں عرض کر چکا تھا' جب آگے چل کر پھر نظامِ صلوٰۃ کی بات آئے گی' اس وقت بھی میں تشریح کرتا چلا جاؤں گا۔

صلوٰۃ کے اجتماع میں انسانی جسم کی صفائی کی تاکید کا معاملہ

اس وقت تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ یہ جو 43ویں آیت سامنے آ رہی ہے اس میں اس اجتماع میں شرکت کے لیے ایک معاشرتی بات کہی گئی ہے۔ قرآنِ کریم جہاں قلب و دماغ کی تطہیر اور پاکیزگی پر زور دیتا ہے' وہ معاشرے کے اندر انسانی جسم کی صفائی پر بھی بڑا زور دیتا ہے۔ صلوٰۃ کا اجتماع خاص طور پر آج کل' برسات کے دنوں میں' جب حبس ہو رہا ہو' کسی جماعت کے اندر کسی اجتماعِ صلوٰۃ میں ذرا کھڑے ہو کر بتایئے' آپ دیکھیں گے کہ اس وقت اس صفائی کی کتنی ضرورت ہے حالانکہ یہ ایک عام انسانی چیز ہے لیکن قرآنِ کریم تو ان چیزوں کو بھی نظر انداز نہیں کرتا' جسمانی صفائی اور کپڑوں کی صفائی کو بھی بڑا ضروری قرار دیتا ہے کہ ایک اجتماع کے اندر بیٹھے ہوئے اگر وہاں تعفن کی یہ کیفیت ہو کہ آپ سارا وقت اسی کے اندر الجھے رہیں' آپ کا دماغ کیا Concentrate (ارتکاز) کرے گا' کیا فیصلے قبول کرے گا۔ اس لیے اس آیہ میں اور اس کے بعد بھی اس قسم کی آیات آئیں گی جن میں یہ کہا گیا ہے کہ اس اجتماع میں شرکت کے لیے بدن کی صفائی نہایت ضروری ہے' کپڑوں کی صفائی بھی بڑی ضروری ہے۔

صلوٰۃ کے اجتماع میں شامل ہونے کی دو تین شرائط اور اُن کی حکمت کی وضاحت

کہا ہے کہ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ (4:43) اے جماعتِ مومنین کے لوگو! جب تم ہوش کی حالت میں نہ ہو یعنی تمہیں معلوم نہ ہو کہ کیا کہہ رہے ہو' خواہ اس کی وجہ کوئی بھی ہو تو اجتماعِ صلوٰۃ میں شریک نہ ہو۔ اس صلوٰۃ سے کیا فائدہ جس میں تم سمجھو ہی نہیں کہ کیا کہہ رہے ہو! یہاں زور اس نسبت سے نہیں کہ صلوٰۃ میں کس طرح سے' کس حیثیت سے' داخل ہونا ہے۔ زور اس پہ ہے کہ ان حیثیتوں میں اجتماعِ صلوٰۃ کے اندر شرکت مت کرو۔ اس میں دو تین شرطیں ہیں۔ پہلی شرط تو یہ ہے کہ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى (4:43)۔ عام طور پہ اس کے معنی کیے جاتے ہیں کہ جب تم نشے کی حالت میں ہو۔ یہ اس کا ایک مفہوم ہے کہ نشے کی حالت ہو' نیند کی حالت ہو' اونگھ کی حالت ہو۔ اور اس سے آگے قرآن حمید نے ایک اور حالت بتائی ہے' ساتھ ہی اس کی علت بتا دی کہ ہم نے جو یہ کہا ہے کہ اس حالت میں اجتماع میں شریک نہ ہو تو اس سے مقصد کیا ہے؟ مقصد یہ ہے کہ حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ (4:43) تا آنکہ تمہیں یہ علم ہو' یہ معلوم ہو کہ ہم کہہ کیا رہے ہیں۔ وہاں تو یہی چیز بتانے کی تھی کہ اونگھ میں یا نیند میں بھی' ایک عرب یہ کچھ کہہ دے گا کہ جسے اس کا علم نہیں لیکن قرآن حمید نے تو اس کی حکمت اور علت بتائی ہے۔ کہا ہے کہ حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ (4:43) تا

آ نکہ تمہیں معلوم ہو کہ ہم کیا کہہ رہے ہیں۔

اور آج کل ہم جو نمازی ہیں‘ ان میں سے کتنے ہی ایسے ہوتے ہیں جنہیں معلوم ہی نہیں ہوتا کہ ہم کہہ کیا رہے ہیں۔ دیکھ رہے ہیں قرآن مجید نے یہاں سُکٰرٰی کے معنی کیا دیئے ہیں! جہالت کا نشہ تو اس میں سب سے پہلے آئے گا‘ شرط یہ پوری کرنی ہے کہ حَتّٰی تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ (4:43) تمہیں معلوم تو ہو کہ ’’ہم کیا کہہ رہے ہیں‘‘۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہاں شاید نوے فیصد یا اس سے بھی زیادہ ہمارے ہاں کے یہ نمازی ہونگے جنہیں معلوم ہی نہیں ہوتا کہ ہم کہہ کیا رہے ہیں۔ ایک تو یہ حالت ہے۔

اب اس کے لیے تجویزیں اور تدبیریں ہوتی ہیں کہ ایک صف ٹیڑھی ہو تو اس کے بعد ہر صف ٹیڑھی ہوتی ہے تو کہتے ہیں کہ صاحب! امام پھر اردو میں کبھی تو نماز کی حالت میں ہی اور کبھی اس کے بعد یا اس سے پہلے بتا دیا کرے کیونکہ اس نماز کے اندر یہ کتنا لمبا چوڑا ہے کہ نمازی پر یہ شرط اتنی زیادہ گراں گزرے کہ صاحب! اس کو اس کا مفہوم یا ترجمہ معلوم نہ ہو۔ وہ ایک آدھ سورۃ یا دو چار کلمے تو اسی طرح سے کہتے رہیں یعنی انہیں کچھ علم نہ ہو مگر دو چار کلمے کہتے رہیں۔ اب اس کے لیے یہ تجویزیں اور یہ تدبیریں کی جائیں گی۔

قرآنِ حکیم کو صرف ناظرہ کی حد تک محدود کر دینے کی گہری سازش اور قرآن کریم کا فرمان

پہلی چیز تو یہ ہے کہ آپ کے دین کی بنیاد کس چیز پہ ہے؟ وہ ضابطۂ حیات قرآن کریم ہے جس پہ دین کی بنیاد ہے۔ قرآن کریم عربی زبان میں ہے‘ مسلمان کے لیے یہ فریضہ کیوں نہ ہو کہ عربی زبان جانتا ہو تا کہ اس کی زبان میں قرآن کریم کو از خود سمجھے لیکن قرآن سے مسلمان کو دور ہٹانے کے لیے تو یہ سب کچھ کیا گیا ہے کہ ناظرہ قرآن مجید کے ثواب میں آپ دیکھیے صاحب! کہ جلدوں کی جلدوں میں زور ہی ناظرہ قرآن مجید پہ دیا جاتا ہے۔ یہ بچے ہی ناظرہ نہیں پڑھتے‘ بڑے بڑے آپ کے ہاں کے جو جیّد حافظ ہیں‘ ان کے ہاں پورا قرآن حمید ایک شب میں‘ ایک شبینے میں‘ ختم ہو رہا ہے۔ اب نہ قرآن حمید پڑھنے والے کو پتہ ہے کہ میں کیا پڑھ رہا ہوں‘ نہ سننے والوں کو پتہ ہے کہ ہم کیا سن رہے ہیں۔ اور قرآنِ حکیم کہتا ہے کہ لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوۃَ وَاَنْتُمْ سُکٰرٰی حَتّٰی تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ (4:43) ’’مت جاؤ صلوٰۃ کے اندر‘‘۔ یہی نہیں کہ یہ تنبیہ تھی کہ جاؤ یا نہ جاؤ‘ یہ حکماً کہا ہے کہ ’’قطعاً نہ جاؤ‘‘۔ ارے مقصد کیا ہے؟ یہ کہ ’’ایسے الفاظ زبان سے ادا کرنا‘ جن کے معنی ہی تم نہیں جانتے‘‘۔ کہا یہ ہے کہ اس صورت میں صلوٰۃ کے اندر مت جاؤ۔

عزیزانِ من! اب ثواب کے لیے تو ان کو مزید پختہ سے پختہ تر کیا جاتا ہے کہ اگر ناظرہ بھی نہ آتا ہو تو اس پہ انگلیاں ہی پھیر چھوڑو۔ ایک ایسا ضابطۂ قوانین‘ قرآنِ کریم‘ جس کے مطابق آپ نے دنیا میں زندگی بسر کرنی ہے اس سے آپ کو کیوں دور رکھا جا رہا ہے؟ یہ یونہی نہیں ہے کہ ایک بات چلی آ رہی ہے‘ یہ بڑی گہری سازش ہے‘ یہ برہمنیت (Priesthood) ہے تا کہ تم ہر معاملے کے اندر ان کے محتاج رہو‘ مولوی صاحب سے جا کر پوچھو۔ قرآن کریم اگر ہر ایک کے سامنے آ گیا تو یہ

مذہبی پیشوائیت باقی نہیں رہ سکتی۔ اور قرآن حکیم کو یوں اس انداز سے رکھیے تو آدمی محنت سے جی چراتا ہے۔ انہوں نے اس سے کیا خوب فائدہ اٹھایا ہے کہ او! کوئی بات نہیں' جو قرآنِ کریم ہے اس سے تمہیں ثواب ہوتا ہے' ایک ایک حرف سے دس دس نیکیوں کا ثواب ہے مثلاً آپ نے الم (الٓمّٓ) کہا تو جو تیس نیکیوں کا ثواب ہے' یہ ہو گیا اور آپ اس کو ساری عمر پڑھتے رہیے اور ثواب کماتے رہیے۔

آج دنیا میں یہی کتاب ہے جو اتنی پڑھی جاتی ہے' کوئی اور کتاب اتنی زیادہ نہیں پڑھی جاتی اور دنیا کی کوئی کتاب اتنی مظلوم نہیں' کوئی کتاب ایسی نہیں جس کو انسان پڑھ رہا ہو اور سمجھ نہ رہا ہو کہ میں کیا پڑھ رہا ہوں۔ آپ کسی کتاب کو اٹھا کر دیکھیے' ایسا نہیں ہے کہ اس کی زبان سے واقف نہیں' اگر اس کی زبان آپ کی قابلیت سے ذرا اونچی ہے' ایک آدھ صفحہ پڑھ کر آپ اسے رکھ دیں گے کہ صاحب! سمجھ میں نہیں آتی۔ آپ نے اگر اسے سمجھنا ہے تو آپ کو پھر اپنا معیار اور قابلیت بلند کرنا پڑتا ہے' آپ کرتے ہیں۔ یہ کس لیے کرتے ہیں؟ آپ نوکریاں ڈھونڈنے کے لیے تو یہ کرتے ہیں مگر کسی کو یہ فکر نہیں کہ مسلمان بننے کے لیے بھی مجھے کچھ محنت کرنا پڑے گی لیکن اس کی ضرورت کیا ہے جب اس سے یہ کہہ دیا جائے کہ ناظرہ پڑھ لیجیے' تب بھی آپ پاس ہو جائیں گے۔ ''مت ماری ہوئی اے اگلے دی جیہڑا اے کم کرے'' (اس کی عقل پہ پتھر پڑے ہیں جو یہ کام کرے)۔ یہ تجوید القرآن اور ناظرہ قرآن پڑھانے کے لیے مدرسوں کے مدرسے کھُلتے چلے جاتے ہیں' پڑھاتے چلے جاتے ہیں' پڑھتے چلے جاتے ہیں۔ یہ اس لیے ہے کہ ان کو قرآن حمید کے معانی سمجھنے سے دور رکھو' قرآن حمید تو اس اجتماعِ صلوٰۃ میں' اس صورت میں' شرکت کی اجازت نہیں دیتا۔ کہتا ہے کہ اس وقت اجتماعِ صلوٰۃ میں جاؤ جب حَتّٰی تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ (4:43) تا آنکہ تمہیں معلوم ہو کہ ''ہم کیا کہہ رہے ہیں''۔

حالت جنابت' مرض' حالتِ سفر' جائے ضروریہ'

عورت سے ہم آغوشی وغیرہ کے بعد صفائی کا مسئلہ

اس کے بعد اگلی بات وہ آئی ہے جو جسمانی صفائی سے متعلق ہے۔ کہا ہے کہ وَلَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِیْ سَبِیْلٍ حَتّٰی تَغْتَسِلُوْا (4:43) (جب تم جنابت کی حالت میں ہو تو غسل کیے بغیر اس اجتماع میں شریک نہ ہو۔ البتہ ایسی حالت میں اگر تمہیں اس اجتماع میں سے یونہی گزر جانا پڑے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے)۔ یہاں حالتِ جنابت کا ذکر ہے جسے مباشرت کہتے ہیں۔ قرآن کریم کا انداز بھی یہی ہے کہ وہ ان چیزوں کو اشاروں اور کنایوں میں بیان کرتا ہے' ایسے ہی بیان کرنا چاہیے' میں بھی اسی طرح سے ہی بیان کرتا ہوا آگے چلا جاؤنگا۔ حالتِ جنابت کے بعد کہا ہے کہ حَتّٰی تَغْتَسِلُوْا (4:43) تاوقتیکہ تم نہا نہ لو

درمیان میں ایک چیز عَابِرِیْ سَبِیْلٍ[1] (4:43) آئی ہے کہ ہاں' مگر یہ ہے کہ اس اجتماع میں اگر تم نے شرکت نہیں کرنی یونہی گزر جانا ہے تو کہا ہے کہ جب تم جنابت کی حالت میں ہو تو غسل کیے بغیر اس اجتماع میں شریک نہ ہو' تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ تم اس حالت میں یونہی گزر جاؤ' اجتماع میں شریک نہ ہو۔ تو گویا اجتماعات ایسے تھے' جن میں بیٹھنا بھی تھا' شریک بھی ہونا تھا' اس میں آنا جانا بھی تھا' خود قرآن کریم نے یہ بات بتادی کہ اس حالت میں شریک نہ ہونا۔ ایک تو یہ چیز ہوگئی۔

آگے کہا ہے کہ وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآىِٕطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً (4:43) اگر تم مریض ہو اور پانی سے تکلیف پہنچنے کا احتمال ہے یا (1) حالتِ سفر میں ہو یا (2) جائے ضرور یہ سے فارغ ہو کر آئے ہو یا (3) عورت سے ہم آغوش ہوئے ہو اور (1)'(2)'(3) کے لیے پانی نہیں ملتا تو ان حالات میں' وضو کرنے کے بجائے (5:6) تیمم کر لیا کرو یعنی پاک مٹی سے آلائش صاف کر لی اور ہاتھ منہ ویسے ہی پونچھ لیے)۔ وہاں تو یہ تھا کہ غسل کرو۔ پانی ہوگا تو غسل کیا جائے گا۔

یا اب پہلی چیز یہ ہے کہ پانی ہے مگر مریض ایسا ہے جسے پانی کے استعمال سے کچھ نقصان کا اندیشہ ہے۔ دیکھیے! قرآن حمید کتنی جزئیات تک پہنچتا ہے! کہتا ہے کہ اگر یہ صورت ہے تو پھر غسل نہ کرو یا کسی جگہ پانی نہیں ہے اور تمہاری کیفیت یہ ہے کہ تم رفع حاجت کے بعد آئے ہو' یا وہی پہلی چیز ہے کہ عورت سے جنابت کی ہے اور پانی نہیں ہے تو اس صورت میں ایک تو یہ ہے کہ جہاں جہاں جسم کے اوپر غلاظت لگی ہوئی ہے' اس کے لیے کہا ہے کہ فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا (4:43)۔ یہ جو ہمارے ہاں لفظ ہے کہ تیمم کر لو۔ تیمم کے معنی ہوتا ہے ''ارادہ کرنا' کسی چیز کا قصد کرنا''۔ یہ کسی چیز کا قصد کرنا ہے کہ اگر تمہارا قصد اور نیت ان اجتماعات میں شرکت کا ہے تو اس کے لیے کہا ہے کہ صَعِيْدًا طَيِّبًا (4:43) اس مٹی سے یہ جو غلاظت ہے' اس کو صاف کرو۔

اب یہ جو یوں ہاتھ دھونا تھا' جسے وضو کہتے ہیں' پانی تو ہے نہیں' کچھ گرد و غبار پڑا ہوا ہوگا کچھ پسینہ آیا ہوا ہوگا۔ اس کے لیے کہا ہے کہ فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ (4:43) اپنے ہاتھوں کو' اپنے چہرے کو' پونچھ لیا کرو۔ یہ نہیں کہا کہ مٹی مل لیا کرو۔ ''مسح'' کے معنی ''پونچھ لینا'' ہوتا ہے۔ ٹھیک ہے ذرا گرد و غبار کو جھاڑ لیا' کپڑوں کو پسینہ آیا ہوا ہے پونچھ لیا' پانی جو نہیں ہے' یہ کیفیت پیدا کر لیا کرو۔ اب یہاں تک یہ بات ہوئی کہ جب تم جنابت کی حالت میں ہو تو غسل کیے بغیر اس اجتماع میں شریک نہ ہو۔ اگر تم مریض ہو اور پانی سے تکلیف پہنچنے کا احتمال ہے یا حالتِ سفر میں ہو یا جائے ضرور یہ سے فارغ ہو کر

[1] امام راغب نے کہا ہے کہ عَبَرَ سَبِیْلٍ کے معنی ہیں ''اس نے راستہ قطع کیا' طے کیا''۔ اسی سے عَابِرِیْ سَبِیْلٍ (4:43) آیا ہے' جس کے معنی ہیں ''راستے کو پار کرنے والے'' (پرویزؒ: لغات القرآن جلد سوم' ادارہ طلوعِ اسلام' لاہور' 1961ء ص:1127)

آئے ہو یا عورت سے ہم آغوش ہوئے ہو اور ان تمام حالتوں میں پانی نہیں ملتا تو ان حالات میں' وضو کرنے کے بجائے تیمم کر لیا کرو یعنی پاک مٹی سے آلائش صاف کر لی اور ہاتھ منہ ویسے ہی پونچھ لیے۔

عزیزانِ من! یہ رعایت اس لیے دی ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَفُوًّا غَفُوْرًا (4:43) (یہ رعایت اس لیے دی گئی ہے کہ خدا کا قانون' مجبوری کی حالت پہ نگاہ رکھتا ہے۔ اس لیے ان مخصوص حالات میں' عام حکم کی پابندی سے درگزر کر دیتا ہے۔ مقصد اس سے یہ ہے کہ ان اجتماعات میں شریک نہ ہونے سے تمہیں جو نقصان پہنچ سکتا تھا' اس سے تمہاری حفاظت ہو جائے)۔ ان قوانین کا دینے والا ایسا نہیں ہے کہ ذرا سی' چھوٹی چھوٹی سی بات پر' تمہارا پلہ پکڑ کر بیٹھ جائے۔ اس کی کشادہ نگہی ایسی ہے کہ ان چیزوں میں وہ آگے گزر جاتا ہے۔ کہتا ہے کہ کوئی بات ہی نہیں' پانی نہیں' یا پانی کے استعمال سے کچھ ضرر پہنچتا ہے' تو وہ آگے گزر گیا' درگزر کر گیا' یہ ہے غَفُوْرًا ۔ اور ان چیزوں کے نہ ہونے کی وجہ سے جو ایک کمی آنی تھی' اس کو وہ پورا کر دے گا اس لیے کہ تمہارے بس کی بات نہیں تھی۔ تم نے اس چیز کی نیت کر لی ہوئی تھی اور جو کچھ تمہارے لیے ممکن ہے وہ بھی تم نے کر لیا ہے۔ اگرچہ وہ چیز پورے طور پہ ہو نہیں پائی' اس کے باوجود اس سے یہ مقصد پورا ہو جائے گا لیکن یہ ان شرطوں کے ساتھ ہے کہ پانی نہ ملے۔

اجتماعِ صلوٰۃ درمیان میں لا کر بات وہیں آ گئی' جہاں سے چلی تھی۔ اس سورۃ کی 41 ویں آیت میں ان لوگوں کی کیفیت کو سامنے لاؤ جو اس نظام کے مخالف تھے' ان کے ساتھ ایک ٹکراؤ تھا' اس ٹکراؤ کی صورت میں قرآن مجید پھر انہی کو سامنے لایا ہے اور یہ تھے جنہیں اہلِ کتاب کہا جاتا ہے۔ یہودی اس میں سب سے زیادہ مخالفت کرتے تھے۔ کہا ہے کہ اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ اُوْتُوْا نَصِیْبًا مِّنَ الْکِتٰبِ یَشْتَرُوْنَ الضَّلٰلَۃَ وَیُرِیْدُوْنَ اَنْ تَضِلُّوا السَّبِیْلَ (4:44)۔

وحی کی بنا پر حضرت نوح علیہ السلام سے حضور نبی اکرم ﷺ تک ملنے والی راہنمائی کی نوعیت اور مخالفین کی کوششیں

قرآن کریم نے یہاں کہا ہے کہ اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ اُوْتُوْا نَصِیْبًا مِّنَ الْکِتٰبِ (4:44) ان میں اُن لوگوں کی حالت خاص طور پر قابلِ غور ہے' جنہیں اس ضابطہ ہدایت کا' جس کی تکمیل اب قرآن کریم میں ہوئی ہے' ایک حصہ دیا گیا تھا۔ الکتاب مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ یہ تو قرآنِ کریم کے اندر آیا ہے۔ اس سے پہلے مختلف انبیائے کرامؑ آئے' انہوں نے مختلف اقوام کو اپنے اپنے زمانے' اپنے اپنے حالات کے مطابق ہدایات دیں' اس کی بنیاد اور اصل تفہیم وہی تھی جو حضرتِ نوحؑ کے زمانے سے رسول اللہ ﷺ تک مسلسل چلی آئی' دین کی اصل وغایت تو وہی رہی۔ جہاں تک احکام کا تعلق تھا' وہ ہر دور کے تقاضوں کے مطابق تھوڑے تھوڑے ملتے رہے۔ یہاں کہا ہے کہ نَصِیْبًا مِّنَ الْکِتٰبِ (4:44) وہ ضابطۂ قانون' الکتاب کا کچھ حصہ' جو ان کو دیا گیا تھا' مکمل نہیں تھا۔ یہ ہے جسے قرآن کریم نے تکمیلِ دین کہا ہے یعنی اَکْمَلْتُ لَکُمْ

دِيْنَكُمْ (5:3) یہ وہی دین ہے جو چلا آ رہا تھا' اسی کی تکمیل قرآنِ کریم نے آ کر کی۔ پہلے جن جن کو ملا' اس کا کچھ حصہ تھا کہ انہیں یہ عطا کیا گیا۔ ان نظامِ خداوندی کی مخالفت کرنے والوں کی کیفیت یہ ہے کہ يَشْتَرُوْنَ الضَّلٰلَةَ (4:44) یہ ہدایت اور صحیح راہنمائی بیچتے ہیں اور اس کی قیمت میں گمراہی خریدتے ہیں۔ ان کی ساری کوششیں اسی گمراہی خریدنے میں صرف ہوتی ہیں۔ یہ باتیں بہت دفعہ آ چکی ہیں' اب ہمیں آگے چلنا چاہیے۔ یہ خود بھی ایسا کرتے ہیں اور وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ تَضِلُّوا السَّبِيْلَ (4:44) چاہتے یہ ہیں کہ تم بھی صحیح راستے سے بھٹک کر ایسے ہی ہو جاؤ۔ سنو! یہ اپنے طور پہ خود کرتے ہو تو جاؤ کرو' ہم تمہیں دعوت دیں گے لیکن یاد رکھو کہ ہر غلط راستے پر چلنے والے کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ باقی لوگ بھی غلط راستے پر چلیں تاکہ انہیں مطعون کرنے والا کوئی نہ ہو۔

بخل کے عمل کی بدنامی سے بچنے کے لیے اختیار کردہ ترکیب کا سہارا

وہ جو پہلی آیتوں میں آیا تھا کہ خود کی کیفیت یہ ہے کہ يَبْخَلُوْنَ (4:37) سب کچھ سمیٹ کر اپنے پاس رکھتے ہیں' سمیٹتے چلے جاتے ہیں اور اب اس پہ خیال آتا ہے کہ معاشرے والے یہ بات کہیں گے کہ صاحب! یہ تو بڑی بات ہے جو یہ کر رہا ہے' اس کے بعد یہ ہے کہ قانون اس قسم کا بنا دیتے ہیں کہ یہ سب کچھ سمیٹ لینا جائز ہے' اس میں کوئی حرج نہیں۔ قانون یہ بنا دیتے ہیں کہ اسلام نے زمین' دولت' موٹریں' محلات' ان چیزوں کی ذاتی ملکیت پر کوئی حد قائم نہیں کی' یہ شرعاً جائز ہیں۔ یہ کچھ قرآن مجید کہتا ہے۔ یہ پھر قانون ایسا بنا دیتے ہیں تاکہ کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ صاحب! یہ کیا ہے جو لوٹ کھسوٹ کر سب کچھ لیے جا رہے ہیں۔ اسی طرح یہ کہا کہ غلط راستے پر چلنے والا خود ہی غلط راستے پر نہیں چلتا' نِکو بننے سے بچنے کے لیے چاہتا یہ ہے کہ سارے ہی ایسے ہو جائیں' یہی ان کی خواہش ہے کہ تم بھی ان کی طرح صحیح راستہ چھوڑ کر غلط راستے پر چل دو۔

کہا ہے کہ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاَعْدَآئِكُمْ (4:45) یہ تمہارے بڑے سخت دشمن ہیں۔ خدا انہیں جانتا ہے کہ یہ تمہارے کتنے بڑے دشمن ہیں! تم ان سے مت ڈرو۔ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَلِيًّا ۙ وَّكَفٰى بِاللّٰهِ نَصِيْرًا (4:45) کسی کی بات مت سنو' وہ تمہاری دوست داری کے لیے' تمہاری مدد کے لیے کافی ہے لہٰذا اس خیال سے کہ ان سے ہمارا بہت زیادہ نقصان ہو جائے گا' مت ڈرو۔ اس نقصان کا سوال ہی نہیں ہے۔ حق کا راستہ تو ایک ہی ہوتا ہے' باقی جو تائید کرتا ہے' وہ تمہارا ساتھی ہے' جو اس کی مخالفت کرتا ہے ''ہمیں بھلا ان سے واسطہ کیا' جو تجھ سے نا آشنا رہے ہیں''[1]۔

محمد علی جوہر کے کردار کی ایک جھلک اور دشمنوں کی پست ذہنیت اور تنگ نظری کچھ ایسی کہ بات صاف اور واضح ہی نہ ہو

اس لگاؤ کی حد تو وہ ہے جسے مولانا محمد علی جوہرؒ مرحوم (1878-1931ء) نے' جو ایک بڑے بیباک اور بڑے جرأت

---

[1] یہ علامہ ڈاکٹر محمد اقبال کے اس شعر کی طرف اشارہ ہے' جو 'بانگِ درا'' میں ہے کہ

یہ زائرانِ حریمِ مغرب ہزار رہبر بنیں ہمارے ہمیں بھلا ان سے واسطہ کیا جو تجھ سے نا آشنا رہے ہیں

منداانسان تھے اور واقعی ان کی اپنی زندگی بھی یہی تھی' کہا ہے کہ

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے تھا

یہ تو دو عالم سے خفا ہونا پڑے گا لیکن اس کے لیے بڑی انقلابی جرأت کی ضرورت ہوتی ہے۔ کہا ہے کہ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ وَلِيًّا ۙ وَّ كَفٰى بِاللّٰهِ نَصِيْرًا (4:45)۔ کتنی عظیم آیتیں ہیں! اللہ تمہارے ان دشمنوں سے واقف ہے۔ ان سے ڈرنے کی بات کیا ہے! تمہارے لیے قانونِ خداوندی کی سرپرستی اور نصرت کافی ہے۔ آگے کہا ہے کہ مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ (4:46) ان کی تو پست ذہنیت یہاں تک آ پہنچی ہے کہ ان کو اگر کوئی چیز دی جاتی ہے' ان کے پاس لکھی ہوئی کتاب ہے' یہ کوئی ایسے الفاظ اس طرح باہر لا کر بیان کریں گے کہ وہ الفاظ ان موقعہ محل سے جدا کر کے' الگ کر کے' کہیں اور لے جائیں' مطلب ہی کچھ اور ہو جائے۔ ایک دشمن بلند ذہنیت کا ہوتا ہے جو ایسا نہیں کرتا بلکہ وہ دھڑلے سے دشمنی کرتا ہے' جھوٹ نہیں بولتا' اس کی مصلحتوں کے تقاضے اسے یہ نہیں کہتے ہیں کہ ''زندگی کی ضروریات کے لیے جھوٹ بولنا جائز ہی نہیں بلکہ واجب ہو جاتا ہے''۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ یہ جو پست سطح پر آ جاتے ہیں' ان کی کیفیت یہ ہے کہ وہ یوں مخالفت نہیں کرتے بلکہ تمہاری باتیں الٹ پلٹ کر باہر بیان کریں گے۔ وَيَقُوْلُوْنَ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ وَّرَاعِنَا لَيًّا بِاَلْسِنَتِهِمْ وَطَعْنًا فِي الدِّيْنِ (4:46) باتیں کریں گے تو اس طرح سے زبان کو توڑ مروڑ کر کہ الفاظ کچھ ہیں اور نکلیں کچھ' یعنی کتنی پست ذہنیت ہے' کتنے تنگ نظر ہیں' یہ اس حد تک پہنچے ہوئے ہیں! بجائے اس کے کہ یہ کہیں کہ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (4:46) ہم نے سنا' ہم اطاعت کریں گے' وہ اَطَعْنَا کا جو لفظ ہے' اس کو ذرا بگاڑ کر چپکے سے عَصَيْنَا کہہ دیں گے کہ ہم نے سنا اور ہم مانیں گے نہیں۔ وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ (4:46) تُو ہماری بات سن' اگرچہ تیری بات نہیں سنی جائے گی یا طنزاً کہیں گے کہ تُو بہرہ ہو جائے۔ وَّرَاعِنَا (4:46) بات تمہاری اس وقت مانیں گے جب کچھ ہماری رعایت کرو گے۔ حق کے ساتھ سودے بازی ہو رہی ہے' اس صورت میں ہم تمہاری بات سنیں گے' زبان سے موڑ توڑ کر باتیں کریں گے۔ قرآن حکیم نے اسی لیے دوسری جگہ جماعتِ مومنین سے کہا ہے کہ وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا (33:70) بات کرو تو ایسی صاف واضح پختہ نکھری ہوئی جیسے تمہارے سامنے ہموار دیوار کھڑی ہو' ذرا سی بھی کہیں کجی نظر نہ آئے' ایسی بات کرو۔

دورِ حاضر کی سیات کی مفلوج کیفیت مبہم اصطلاحات کے استعمال کی بنا پر ہے

دورِ حاضرہ کی سیاست کا راز ہی اس میں ہے کہ کبھی صاف بات نہ کرو' جو آج بیان دو' کل ہی یہ کہہ دو کہ یہ میرا مطلب تھا ہی نہیں۔ یہ ہم پہ عجیب قسم کے دَور آئے ہوئے ہیں کہ اصطلاحات مبہم ہیں۔ کہا کہ کبھی ان کا مقصد واضح کر کے نہ بتاؤ' یہ کبھی نہ بتائیں کہ اسلامی نظام ہوتا کیا ہے' یہ اقامتِ دین' شریعتِ حقہ' اسلامی نظام' اسلامی قوانین کی اصطلاحات عام

ہیں۔مقصد واضح نہیں ہے۔اُدھر سے اگر ہمارے ہاں معاشیات آئی ہے' تو اس میں بھی ابہام ہی ابہام ہے' مثلاً سوشل ازم' اسلامی سوشل ازم' محمدی مساوات' قرآنی نظام۔او! کوئی کسی کو بتائے تو سہی کہ یہ کیا ہوتا ہے۔قرآن حمید وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا (33:70) کہتا ہے: صاف واضح نکھری ہوئی بات' دوٹوک' کبھی ذومعنی بات نہیں' یہ کچھ کہو۔وَلَوْ اَنَّهُمْ قَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا وَاسْمَعْ وَانْظُرْنَا لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاَقْوَمَ (4:46) او! سیدھی طرح سے تم کہو کہ ہم نے سنا' ہم اطاعت کریں گے' ہماری بات سنیے اور ہماری طرف نگاہ التفات رکھیے' تم شریفوں کی طرح' بھلے مانسوں کی طرح' صاف صاف' سیدھی سیدھی بات کرو' تو یہ تمہارے لیے بہتر ہوتا۔یہ تمہارے لیے تمہاری روح کی افزودگی کا باعث بنتا۔وَلٰكِنْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ (4:46) لیکن ان کے ہاں انکار وسرکشی ہے۔قرآن مجید اس کو کفر قرار دیتا ہے۔

دل کی گھٹن' افسردگی و پژمردگی' انسان کی غلط بیانی کا ہی فطرتی نتیجہ ہوتی ہے

آپ دیکھتے ہیں کہ ان کے ہاں اس میں دل کی گھٹن ہوتی ہے۔اس میں دنایت اور کمینگی ہوتی ہے۔قرآن مجید کہتا ہے کہ یہ کفر ہے۔اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ جو صاف صاف بات کرنے کی جتنی خوشگواریاں آنی تھیں' تم ان سے محروم ہو جاؤ گے۔ لعنت کے معنی ہوتا ہے ''اچھی چیزوں سے محروم ہونا''۔کہا ہے کہ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا (4:46) جن کی ذہنیت ایسی ہو' یہ ایمان کیا لائیں گے۔اور واقعی اہلِ کتاب کو آپ دیکھیے' بہت کم تھے' یونہی انگلیوں پہ گنے جانے والے تھے' جو ایمان لائے تھے۔یہ لوگ ایمان نہیں لاتے۔دین کو چھوڑ کر جو بھی مذہب کی سطح پہ آ جاتا ہے' وہ پھر دین کی طرف نہیں آتا۔

مذہب کی چند ایک رسومات دین کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں

دین کی طرف تو وہ آ سکتا ہے جو پہلے سے کسی مذہب کا قائل نہ ہو۔دہریہ اگر اسلام قبول کرے گا تو وہ تو دین پر آ جائے گا' مذہب پرست جنہیں اہلِ کتاب کہا جاتا ہے' وہ دین کی طرف کبھی نہیں آئیں گے۔اس لیے کہ دین کی طرف آنے کے لیے اولیں شرط یہ ہے کہ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۗ لَا انْفِصَامَ لَهَا (2:256) ہر غیر خداوندی نہج' تصور' عقیدہ' عمل' رسم سے پہلے انکار کرو' لا الہ الا اللہ کرو' جب یہ سلیٹ دھل جائے تو اس کے بعد پھر آگے ایمان باللہ آتا ہے۔یہ لکھی ہوئی سلیٹ پر نہیں لکھا جا سکتا۔یہ بڑا غیور ہے' یہ گھر کے باہر کھڑا رہتا ہے کہ یہ جو اندر بیٹھا ہوا ہے پہلے اس کو نکالو' پھر داخل ہوتا ہے۔اس لیے یہ کہا ہے کہ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا (4:46) یہ لوگ جو اسی چیز کو' مذہب کو اور رسومات کو صحیح دین اور حق سمجھے ہوئے ہیں یہ اس انقلابی پروگرام پر کیسے آئیں گے۔ یہ نہیں آئیں گے اور اہلِ کتاب نے کبھی بھی اسلام قبول نہیں کیا۔اور یہی وجہ ہے جو آج آپ کو اتنی دشواری پیش آ رہی ہے۔ آواز اتنی بلند ہو رہی ہے جتنی شاید اس سے پیشتر کبھی کسی دور میں نہیں ہوئی: ''اسلام اسلام' اسلام کے قالب میں اپنے آپ کو ڈھال لو' اسلام کے مطابق زندگی بنا لو' اسلامی نظام قائم کرو''۔ہر شخص یہ کہتا چلا آ رہا ہے اور اس کے بعد کیفیت یہ ہے کہ

جہاں کھڑے تھے' وہیں کے وہیں ہیں' کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہو رہی۔ یہ کیا ہے؟ یہ کہ آج بھی ہم اس سطح پہ ہیں جہاں اہلِ کتاب تھے کہ جو کچھ ہمارے ہاں ہوتا چلا آ رہا ہے' وہ ٹھیک ہے' دین ان کے سامنے آنے ہی نہ پائے۔

''اے اہلِ کتاب! ایمان لاؤ'' کے سلسلہ میں ایک غلط فہمی کا ازالہ

قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا (4:47) اے اہلِ کتاب! اس کے اوپر ایمان لاؤ۔ پہلے بھی میں کئی دفعہ عرض کر چکا ہوں کہ یہ جو قرآن کی اصطلاح ہے کہ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ (4:47) اس کے غلط مفہوم نے بڑی پیچیدگیاں پیدا کر دیں۔ ہم نے اس کا مفہوم یہ لیا اور لوگوں کو بھی یہ بتایا کہ ''جو تصدیق کرتا ہے ان چیزوں کی جو تمہارے پاس ہیں'' تو وہ اہلِ کتاب یہود و نصاریٰ یہ کہتے ہیں کہ تمہارا قرآن مجید تصدیق کرتا ہے جو کچھ ہمارے پاس ہے تو پھر ہم اس پہ ایمان کیوں لائیں۔ وہ جس کی تصدیق کرتا ہے اس پہ تو ہم ایمان لائے ہوئے ہیں۔ یہ بڑا معقول اعتراض ہے۔ اور پھر یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی کہ قرآنِ کریم شروع سے آخر تک ان کو بتاتا چلا جاتا ہے' وہ کہتا ہے کہ تم نے اپنی کتابوں کی تحریف کر دی۔ وہ کہتا ہے کہ تمہارے پاس وہ نہیں ہے جو کتابیں ہم نے تمہارے نبی کو دی تھیں۔ اور اس کے باوجود ہم ان سے کہتے ہیں کہ صاحب! یہ اس کی تصدیق کرتا ہے جو تمہارے پاس ہے تو کیا یہ انجیل کی تصدیق کرتا ہے (معاذ اللہ)۔ 'یہ تصدیق کرتا ہے' جو اردو زبان میں اس کے معنی ہیں' وہ ہم نے لے لیے۔ تصدیق کے معنی Verify کرنا ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ ذرا اس سے تصدیق کرا لائیے' جی! مصدق کے یہ معنی نہیں ہیں۔ اس کے معنی ہیں کہ ''وہ جو دعاوی تم کر رہے ہو لیکن وہ پورے نہیں ہو رہے' ان کو یہ سچ کر کے دکھانے والا ہے''۔ صدق کے معنی ہوتا ہے ''کسی کے دعوے کو سچ کر کے دکھا دینا''۔ کہا ہے کہ تم دعوے تو کرتے ہو لیکن تمہارا کوئی دعویٰ سچ ہو کر سامنے نہیں آتا۔ ان کے بھی دعاوی یہ تھے کہ تیری مرضی پوری ہو جو تیری حکومت آسمانوں پہ ہے' وہ زمین کے اوپر ہو۔ یہ ان لوگوں کے دعاوی تھے' یہ پورے نہیں ہو رہے تھے' یہ ان دعاوی کے لیے کسی آنے والے کا انتظار کرتے تھے۔ اُس نے کہا یہ تھا کہ تم جو دعوے کرتے ہو اور وہ تم سے پورے نہیں ہو رہے اوسنو! وہ اس لیے پورے نہیں ہوتے کہ تمہارے پاس وہ دین اپنی اصلی شکل میں نہیں رہا۔ اب یہ آیا ہے' یہ قرآن کریم اور قرآن کریم کا لانے والا ہے جو تمہارے دعاوی کو سچ کر دکھائے گا کیونکہ وہ مذہب نہیں' دین ہے۔ اب یہ وہی چیز آ گئی جو میں نے عرض کیا تھا کہ جسے ہم ہمیشہ قیامت پر اٹھا رکھتے ہیں لیکن یہ یہاں کا نظام ہے جو محمد رسول اللہ ﷺ والذین معہٗ کے مقدس ہاتھوں سے متشکل ہوا تھا۔ اس لیے کہا ہے کہ اے اہلِ کتاب! تم اس ضابطہ حیات پر ایمان لے آؤ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا فَنَرُدَّهَا عَلٰٓى اَدْبَارِهَآ (4:47) قبل اس کے کہ تمہارے ہاں کے جو بڑے بڑے سردار واقع ہوئے ہیں' ان کا چہرہ مسخ ہو جائے' وہ پیٹھ دکھا کر میدان سے بھاگ جائیں۔

وحیٔ خالص کی روشنی میں قائم کردہ نظام کا نتیجہ

آپ دیکھیے کہ ان یہودیوں کے ساتھ کیا ہوا؟ جب یہ مسلمان ہجرت کر کے' مظلوم' بے کس' ناتواں سی ایک قوم کی حیثیت سے مدینے میں آئے ہیں' یہاں کے یہودی فی الواقعہ اس وقت ''اصحاب سبت'' تھے' اس وقت ان سے یہ کچھ کہا جا رہا تھا اور وہ مذاق کرتے تھے کہ 'ذرۂ ناچیز و تعمیرے بیابانے نگر' ان کے دعوے دیکھیے روٹی کھانے کو نہیں ملتی۔ جب یہی یہودی چند ہی سال کے عرصے کے اندر مدینے سے نکلے تو انہیں کہیں پناہ نہیں ملی۔ وہاں سے بھی جس ذلت و خواری کے ساتھ نکلے ہیں' تاریخ اس کی مثال پیش نہیں کرتی۔ انہیں پورے ملک سے ملک بدر کر دیا گیا۔ سچائیاں جب آتی ہیں تو وہ تو پوچھو نہیں کہ اپنے اندر کتنی قوتیں رکھتی ہیں!

اصحابِ سبت کی تباہی کی وجہ قانون شکنی تھی

عزیزانِ من! کہا ہے کہ اَوۡ نَلۡعَنَهُمۡ كَمَا لَعَنَّاۤ اَصۡحٰبَ السَّبۡتِ (4:47) یا یہ ان خوشگواریوں سے محروم رہ جائیں جیسے کہ اس سے پیشتر تم خود جانتے ہو کہ تمہارے ''اصحاب سبت'' کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ میں یہ بات واضح کر چکا ہوں کہ اصحاب سبت کی یہ کیا چیز تھی۔ یونہی مختصر الفاظ میں یہ عرض کر دوں کہ جب قوم میں قانون شکنی عام ہو جاتی ہے تو یہ جو قانون کی چھوٹی چھوٹی چیزیں ہوتی ہیں' تو ہر انسان ان کو توڑنے کے راستے بھی تلاش کرتا رہتا ہے۔ یہ ہمارے ہاں جو ہفتے میں گوشت کا دو دن کا ناغہ ہوتا ہے' یہ ایک معاشرتی قانون ہے' معاشرے کے فائدے کی چیز ہے لیکن قوم میں قانون شکنی کا رجحان اتنا ہو گیا ہے کہ یہ دو دن کا ناغہ توڑنے کی خاطر' فریج والے گھرانے' سوموار کو ہی اتنا لے جاتے ہیں کہ جمعرات تک چلتا ہے حالانکہ آپ کو وہ واقعہ یاد ہو گا کہ حضرتِ عمرؓ (644/45-581ء) نے قصاب کی دکان پہ اپنے چچازاد بھائی کو دیکھا کہ اپنی ضرورت سے زیادہ گوشت لے رہا تھا۔ آپؓ نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا' کہنے لگے کہ تمہارے ہمسائے کو بھی گوشت کی ضرورت ہے' یہ نہیں ہے کہ تمہارے پاس پیسے زیادہ ہیں تو ساری دکان خرید کر لے جاؤ حالانکہ وہ چوری تو نہیں کر رہا تھا۔ خریداری میں بھی انہوںؓ نے کہا کہ یاد رکھو کہ چیزیں ہر ایک کے حصے میں آئیں۔ دیکھتے ہیں ان لوگوں کی کہاں تک نگاہیں جاتی تھیں!

عزیزانِ من! ہفتے میں گوشت کے ناغے کے دوران اول تو وہ آج ہی اتنا خرید لیتے ہیں اور اگر ایسا نہ ہو تو پھر وہ تو عام ہے کہ باہر کا دروازہ بند ہے' پچھلا دروازہ کھلا ہے' اور پھر وہی ہوتا ہے جیسے رمضان کا احترام ہوا کرتا ہے۔ یہ کیا چیز ہے؟ یہ قانون شکنی کی عادت ہے۔ جب یہ عادت قوم میں پڑ جائے تو قانون کی اطاعت ان پر بڑی گراں گزرتی ہے خواہ وہ دائیں یا بائیں ہاتھ جانے کی بات ہی کیوں نہ ہو۔ میں کئی دفعہ کہا کرتا ہوں کہ یہ Keep to the left (بائیں ہاتھ چلو) چھوٹی سی چیز ہے' اس میں تمہارا ہی بھلا ہے' اس کی خلاف ورزی سے ایکسیڈنٹ ہو جائے گا۔ چوراہے پہ جا کر دائیں طرف جانے کے لیے گول چکر پر کوئی ایک پاؤں سائیکل کا قوم کو گوارہ نہیں اور دور سے دیکھا کہ وہ ٹریفک والا نہیں ہے تو وہاں پہنچ کر سیٹی بجاتا

ہوا دائیں طرف چلا جاتا ہے اور خوش ہوتا ہے۔ پھر قوم کو قانون شکنی میں لذت ملتی ہے۔ عزیزانِ من! یہ چیز تھی جو اس قوم کو دو سال سے میں مسلسل کہہ رہا تھا' جب یہ قانون شکنیوں کا جشن منا رہے تھے' میں ان سے کہہ رہا تھا کہ قوم کو یہ عادت نہ ڈالو' جب قانون شکنی کی عادت پڑتی ہے تو پھر وہ یہ نہیں دیکھتی کہ کس کا قانون اور ضابطہ ہے' آج ان کے خلاف تم یہ کچھ کر رہے ہو' کل تمہارے خلاف یہی کچھ ہوگا' قوم کو قانون کا احترام سکھاؤ۔ یہ سبت کی بات اتنی سی تھی۔ کہا یہ تھا کہ ایک دن ناغہ کرنا ہے' تم نے مچھلیاں نہیں پکڑنی' یہ جو کچھ ہم کر رہے ہیں' اسی روش پہ وہ بھی گامزن تھے۔ قرآن کریم نے کہا کہ اس قوم کی یہ ذہنیت ہو چکی ہوئی ہے۔

عزیزانِ من! میں نے عرض کیا تھا کہ ہم اہلِ کتاب کی سطح پہ آ چکے ہیں۔ آپ دیکھتے ہیں کہ کیسے تسلسل سے ان کے پیچھے ہم چل رہے ہیں! کیا اصحابِ سبت ہم نہیں ہیں؟ تو کیا وہ جو اس نے قرآن کریم میں کہا تھا کہ زندگی کی خوشگواریوں سے محروم رہ جاؤ گے' ہر شخص ہم میں سے رو نہیں رہا؟ خدا کا عذاب یوں آتا ہے۔ قرآن حمید کہتا ہے کہ وَكَانَ أَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا (4:47) ۔ اللہ اکبر! یاد رکھو! یہ تنبیہ یونہی دھمکی نہیں ہے' یہ یونہی کسی بڑ مارنے والے کی بڑ نہیں ہے' یہ اس قادرِ مطلق کا قانون ہے جو ہمیشہ ہو کر رہتا ہے اور کسی خاص دور میں ہی ہو کر نہیں رہتا بلکہ جب بھی کہیں سبت کی ذہنیت پیدا ہوگی' وہی لعنت اس قوم پر مسلط ہو جائے گی وَكَانَ أَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا (4:47) یاد رکھو! یہ تنبیہ یونہی دھمکی نہیں۔ یہ قانونِ خداوندی کا اعلان ہے اور خدا کے قانون کے نتائج سامنے آ کر رہا کرتے ہیں۔ اس کی کوئی اسکیم ناکام نہیں ہو سکتی۔

یہ چیزیں کیوں ہوتی ہیں؟ اگلی ہی آیت میں یہ بات بتا دی کہ توحید یہ ہے کہ ایک خدا کے قوانین ہیں اور ان کے سامنے دل کے جھکاؤ سے' اطاعت کرتے چلے جانا ہے' جھک جانا ہے' کسی اور کو اس کے اندر شریک نہیں کرنا ہے۔ یہ بڑی چیز ہے۔

توحید کے مفہوم کی محسوس مثال

عزیزانِ من! توحید کے معنی سمجھانے کے لیے میں یہ کہا کرتا ہوں کہ کوئی فارمولا آپ کے پاس ہو' سائنس کا فارمولا' میڈیسن کا فارمولا' ڈاکٹر کا نسخہ' کوئی آپ کے پاس ہو' آپ اس میں سے کوئی جزو نکال کر' اس میں دوسرا شریک کر دیجیے' یہ شرک ہوتا ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ اس سے نہ صرف یہ کہ وہ نتیجہ مرتب نہیں ہوتا' بلکہ اس کے خلاف کئی خطرناک چیزیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اسے شرک کہتے ہیں۔ پھر اگلا شرک لیجیے' انسان اپنے عہدِ طفولیت میں جب پہلے دور میں تھا تو اس وقت علم' عقل' سائنس کے انکشافات' اس کے سامنے نہیں تھے' فطرت کی قوتیں مہیب انداز میں چاروں طرف سے اس کے خلاف آتی تھیں' یہ نہتا کمزور تھا' ڈرتا تھا' سہما ہوا ہوتا تھا۔ اس کی کیفیت یہ تھی کہ دریا امڈ کر آیا تھا تو یہ ہاتھ جوڑ لیتا تھا' اس بیچارے کمزور کو' کچھ اور آتا ہی نہیں تھا سوائے اس کے کہ وہ اس کے آگے ہاتھ جوڑ لے' گڑگڑانے لگ جائے' آنسو بہانے لگ

جائے' منتیں کرنے لگ جائے' سماجتیں کرنے لگ جائے۔ کمزور کرتا ہی یہی ہے۔ یہ جو اللہ ہے اس کے علاوہ کسی اور کے سامنے جھکنا شرک ہے۔ یہ وجہ ذلتِ انسان ہے۔ صرف اسی ایک اللہ کی محکومیت اختیار کرنے کا نام توحید ہے۔

معاشرتی اور تمدنی طور پر غلامی کی محسوس عملی شکل

آج بھی جو ذی احتیاج ہوتا ہے' اس کو دیکھو' اس کے سامنے کھڑے ہوئے جس سے وہ سمجھتا ہے کہ میری احتیاج پوری ہوگی' وہ وہاں کیا کچھ نہیں کرتا۔ یہاں اس غلط نظام میں تو ذی احتیاج کی حق تلفی کی حد کر دی گئی ہے۔ مزدور دن بھر مزدوری کرنے کے بعد' جو As of right (بطور حق) اپنی مزدوری لے سکتا ہے' وہ بھی جب جاتا ہے تو قطار میں یوں کھڑا ہوتا ہے' جیسے خیرات مانگ رہا ہے' وہ اس کو دھتکارتا ہے' یہ اس کے سامنے گڑگڑاتا ہے۔

اپنے پہلے دور میں انسان کی یہ حالت تھی کہ فطرت کی ہر قوت کے سامنے کانپتا تھا' گڑگڑاتا تھا' اس کے سامنے سجدہ کرتا تھا' نذر نیاز دیتا تھا۔ یہ شرفِ انسانیت کی کتنی ذلت تھی! اس سے ذرا اور آگے بڑھا' پروہت آئے' ذرا زیادہ سمجھدار سیانے آئے' انہوں نے اپنی عقل کے زور پر یہ جو باقی تھے' ان سے اپنی باتیں منوائیں۔ اُن کے سامنے اس نے گڑگڑانا شروع کر دیا۔ راز اُنہوں نے یہ رکھا کہ ہم یہ کچھ نہیں کرتے' یہ بت کرتے ہیں جو تمہارے سامنے ہیں' ہم ان سے کروا دیتے ہیں' ہم بیچ میں نہ ہوں تو براہِ راست تم ان سے کچھ نہیں کرا سکتے۔ پھر انہوں نے ان کے سامنے گڑگڑانا شروع کر دیا۔

تمدنی سطح پر فرعونیت کے دور میں شرفِ انسانیت بک جاتا ہے

پھر اس کے بعد استبداد والی حکومت آئی' فرعون آیا' اس نے کہا کہ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى (79:24) تمہاری پرورش میں ہی کرتا ہوں۔ کھانے پینے کو میں دیتا ہوں۔ میں ہی تمہارا ''اَن داتا'' ہوں۔ اس لیے تمہارا سب سے بڑا رب میں ہی ہوں۔ ہوا یہ کہ رزق کے سرچشموں کو اپنے ہاتھ میں لیا اور اس کے بعد ایک ایک سے روٹی کی خاطر سجدے کرائے' پھر انسانیت بک گئی' پھر اس کا شرف جاتا رہا۔

دین کا نظام ملائکہ کو سرِ تسلیم خم کرنے پر مجبور کر دیتا ہے

اور پھر جب یہ انقلاب آفریں الدین آیا جس نے آ کر کہا کہ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا (45:13) فطرت کی قوتوں کو ہم نے تمہارے لیے تابع فرمان بنا رکھا ہے۔ یہ جو آدم کو ملائکہ نے سجدہ کیا تھا' وہ یہی چیز تھی۔ آج تم ان کے سامنے جھکتے ہو حالانکہ انہیں تمہارے سامنے جھکنے کے لیے بنایا گیا ہے' اٹھو! سائنس کا علم حاصل کرو' ایک ایک قوت تمہارے سامنے جھکے گی۔ آپ نے دیکھا کہ کس طرح ساجد کو مسجود اور مسجود کو ساجد بنایا۔ اب آگے آئی یہ پروہتوں کی جماعت اور سنیے! کہ ان احبار و رہبان سے کیا کہتے ہیں؟ یہ کہ خدا اور بندے کے درمیان کوئی دوسرا شامل نہیں ہوا کرتا' اس کا

سوال ہی نہیں ہے کہ تمہاری بات ان کے ذریعے خدا تک پہنچے۔

حق حکومت سوائے خالقِ کائنات کے کسی کو حاصل نہیں

سوال تو اس کے قانون کا ہے لہٰذا یہ قانون موجود ہے' اس کی اطاعت کرو' نتیجے نکلیں گے' یہ درمیان میں آنے والے کون ہیں انہیں کاٹ کر رکھ دیا۔ یہ جو حاکم بنے بیٹھے ہیں کیا انہوں نے اپنا حقِ حکومت سمجھ رکھا ہے۔ سنو! مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (3:79) کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں ہے' خواہ اس کے پاس قانون سازی کی قوت ہو' خواہ اس کے پاس حکومت کی قوت ہو' وہ نبی بھی کیوں نہ ہو کہ کسی دوسرے انسان سے کہے کہ تم خدا کے نہیں' میرے محکوم بنو۔ یہ کسی کو حق حاصل نہیں۔ اللہ اکبر! انسان کو کس قدر بلند مقام پر لا کر کھڑا کر دیا۔ ایک خدا کے سامنے جھکنے سے انسان ساری دنیا کی چوکھٹوں سے سرفرازانہ گزر گیا۔ قرآن کریم نے کہا ہے کہ شرک وجہِ تذلیلِ انسانیت ہے' خدا کا اس میں کچھ نہیں بگڑتا' تم سینکڑوں معبود بنالو' بگڑتا تو وہ ہے جس کی حکومت تمہارے ووٹوں کے سہارے پہ چلتی ہے۔ وہ تو اس وقت بھی حاکمِ مطلق تھا جب کوئی انسان نہیں تھا' اس وقت بھی رہے گا جب کوئی نہیں ہوگا اور تم سارے کے سارے اگر اس سے انکار کر دو گے تو اس کا کیا بگڑے گا' تمام دنیا آنکھیں بند کر لے تو سورج کی روشنی میں کچھ فرق نہیں آ جائے گا' تم ہی اندھے ہو جاؤ گے۔

دین کا نظامِ حیات سراپا شرفِ انسانیت ہے جبکہ شرک تذلیلِ انسانیت

یہ سوال نہیں ہے کہ شرک میں خدا کے سوا دوسرے کو اگر معبود مان لیا جائے ''تے اللہ نوں غصہ آ جانداے'' (تو پھر اللہ کو غصہ آ جاتا ہے)۔ عزیزانِ من! یہ بات نہیں۔ دین کے معنی ہی یہ ہیں کہ وہ شرفِ انسانیت کو بلند کرتا ہے' شرک شرفِ انسانیت کی تذلیل ہے' فطرت کی کسی قوت کے سامنے جھکنا شرک ہے' وہ قوت جو تمہارے لیے مسخر کر دی گئی' اس کے سامنے جھکنا شرفِ انسانیت کی ذلت ہے۔ انسان جو سارے برابر ہیں' ان کے لیے کہا ہے کہ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ (17:70) ہم نے تمام فرزندانِ آدم کو واجب التکریم بنایا ہے۔ اپنے جیسے کے سامنے جھکنے کا سوال ہی نہیں ہے۔ اللہ کے علاوہ کسی اور کے سامنے جھکنا شرک ہے' یہ وجہِ ذلتِ انسان ہے۔

جھکنے کے معنی اطاعت اختیار کرنا ہے' محکومیت اختیار کرنا ہے۔ عزیزانِ من! اس اللہ کے علاوہ کسی اور کے سامنے جھکنا شرک ہے۔ جو کہا گیا ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ (4:48)۔ ہمارا مروجہ ترجمہ یہ ہے کہ شرک معاف نہیں ہوسکتا' اس کے علاوہ جو کچھ بھی ہوگا' وہ معاف ہوسکتا ہے' یہ نہیں ہوسکتا۔ ''مغفرت'' کے معنی اب آپ احباب کو معلوم ہیں۔ مفہوم اس کا یوں ہوا کہ شرک سے انسانیت کے شرف کو جو نقصان پہنچتا ہے' اس کی تلافی نہیں ہوسکتی اور نقصانات کی تلافی ہوسکتی ہے اور نقصانات جزوی ہونگے' یہ نقصان بنیادی اور اصولی ہے۔ اس سے انسان اپنے

مقام پہ نہیں رہتا:

پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات
تُو جھکا جب غیر کے آگے نہ تن تیرا ' نہ من

یہ ہے شرک کا نقصان۔ ہاں البتہ اس شرک کے نقصان سے انسان قانونِ خداوندی کے مطابق محفوظ رہ سکتا ہے۔

مذہب تو اپنے اندر شرک کی کئی شکلیں لیے ہوئے ہے

میں نے ابھی ابھی عرض کیا ہے اور اسے پھر دہرا دوں کہ جب دین مذہب میں بدلا' تو انہوں نے شرک کی ایک ہی شکل باقی رکھ دی اور وہ ہے 'بتوں کے سامنے نہیں جھکنا' بس ٹھیک ہے اور اس کے بعد مسلمان مطمئن ہو گئے کہ ہم تو شرک نہیں کرتے۔ اب انسان یہ کہتا ہے کہ جی! میں بت پرستی تو نہیں کر رہا اور بُت بھی وہ ہے جس کی ذرا کچھ شکل بنا دی جائے۔ اگر اس بت کی شکل یوں نہ بنائی جائے' اس کو قبر کی صورت بنا دیا جائے تو یہ بھی بت نہیں ہے یہاں روز سجدہ ہوگا' شرک نہیں ہے صاحب! شرک تو مہاجنوں کے مندر میں آتا ہے۔ ارے یہ بھی نہ سوچا کہ ان کی تو پھر بھی وضع قطع تو تھی' تم نے جو کیا اس کے لیے سنو تو قرآن مجید کہتا ہے کہ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ (95:5) جب یہ کم بخت گرتا ہے تو پھر گرتے ہوئے پتہ نہیں چلتا کہ یہ انتہاؤں تک جا پہنچتا ہے۔ یہاں سے یہ گرا ہے' چبوتروں کو سجدے کر رہا ہے' یہاں ایک پاؤں کا نقش لگا ہوا ہے' اس کو سجدے کر رہا ہے۔ کہتا ہے کہ یہاں حضرت صاحب بیٹھتے تھے' اس کو سجدے کر رہا ہے۔ یہ پست ترین سطح پہ پہنچ گیا ہے ۔ایسا کیوں عام ہو رہا ہے؟ اس لیے کہ شرک کی ایک ہی شکل بتا دی اور وہ ہے بت کو سجدہ کرنا۔ اب یہ ہے کہ بت کو سجدہ نہیں کرنا۔ اور اقبالؒ (1877-1938ء) نے کیا کہا ہے؟ یہ ایسا عمدہ طنز ہے! میں پھر وہی بات کر دوں کہ میری بچیاں کہیں گی کہ ترجمہ کر دو۔

برہمنے بہ غزنوی گفت کرامتم نگر

ایک برہمن نے محمود غزنوی سے کہا کہ ذرا ہماری کرامت دیکھیے

تُو کہ شکستۂ ' بندہ شدی ایاز را

پتھر کے بتوں کو تو تُو نے چھوڑ دیا لیکن ایاز کا غلام بن کر رہ گیا۔ اس کے ''عشق'' میں کھو کر اس کے بُت کا پرستار بن گیا۔ ذرا ہماری کرامت دیکھو کہ تمہیں ہم نے کس شرک کے اندر الجھا دیا۔ کیا بات ہے کہ مسلمان کی یہ کیسی تعریف کر دی!

تُو کہ شکستۂ ' بندہ شدی ایاز را

(اقبالؒ: پیامِ مشرق)

تُو نے بُت کو توڑا' تُو ایاز کا غلام بن گیا اور اپنے نفس کو مطمئن کر لیا کہ یہ شرک نہیں ہے۔ جب خواجہ حسن نظامی مرحوم

(1876-1955ء) نے ''مرشد کو سجدۂ تعظیم'' کتاب شائع کی تھی تو اس پر بڑے بڑے فتوے لگائے گئے اور کہا گیا تھا کہ مرشد کو سجدہ بالکل جائز ہے صاحب! یہ نہایت ضروری ہے۔

حدیث نبوی ﷺ میں شرک کی جامع تعریف

میں عرض کر رہا تھا کہ قرآن حکیم نے شرک کی کیا کیا شکلیں بیان کی تھیں۔ سب سے پہلا شرک' تو میں نے کہا تھا کہ یہ ہے آپ کے ہاں کے جو پروہت تھے' انہوں نے شروع کیا تھا۔ کیفیت یہ ہے کہ اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (9:31) یہ لوگ اپنے علماء و مشائخ کو' خدا سے ورے ہی' اپنا خدا بنا لیتے ہیں۔ عزیزانِ من! دیکھتے چلے جایئے' ایک ایک شق اسے ثابت کرتی چلی آ رہی ہے۔ اس کی تشریح میں ایک حدیث بھی آتی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ وہ نہایت عمدہ تشبیہ ہے کہ غالباً یہودیوں میں سے انہوں نے آ کر کہا کہ یہ آپ ﷺ نے کیسے کہہ دیا کہ ہم انہیں معبود بناتے ہیں' خدا سے ورے ہی انہیں خدا تسلیم کر لیتے ہیں' ہم تو ایسا نہیں کرتے۔ آپ ﷺ نے کہا کہ کیا یہ صورت نہیں ہے کہ تمہارے احبار و رہبان جس چیز کو حلال کہہ دیتے ہیں' اسے حلال مان لیتے ہو' جسے وہ حرام کہہ لیں' اسے تم حرام مان لیتے ہو؟ اُنہوں نے کہا تھا کہ جی ہاں! فتویٰ تو انہی سے لیتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہی تو ان کو خدا بنانا ہے' یہی تو خدا بنانا ہے۔

دین میں کسی انسان کو سند تسلیم کر لینا ہی تو شرک ہے

برادرانِ عزیز! دین میں کسی انسان کو سند تسلیم کر لینا' شرک ہے اور اسی لیے اب اگلی بات شرک کی آتی ہے۔ یہ جتنے فرقے آپ کے ہاں بنتے ہیں' وہ فرقے وہ ہیں جو خدا سے ورے' کسی نہ کسی انسان کو' اپنی سند بناتے ہیں' فرقہ کسی انسان پہ جا کر رک جاتا ہے' جو کچھ ان کا ارشاد' ان کا فیصلہ ہوتا ہے' اُسے وہ دین میں یا شریعت میں سند سمجھتے ہیں۔ اور یہ وجہ ہے کہ قرآنِ کریم نے یہاں احبار و رہبان کے متعلق کہا ہے کہ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا ۭ كُلُّ حِزْبٍۢ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ۝ (30:31-32) دیکھنا مسلمانو! کہیں توحید پرست ہونے کے بعد پھر مشرک نہ ہو جانا' اُنہوں نے کہا کہ نہیں صاحب! کیا ہم کوئی بت پرستی کریں گے؟ کہا کہ شرک یہی 'بت پرستی' نہیں ہے۔ دیکھنا! کہیں تم فرقوں میں نہ بٹ جانا۔ اس کے بعد ہر فرقے کی ذہنیت یہ ہو جاتی ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ ہم حق پہ ہیں' دوسرے سب باطل ہیں۔ کہا ہے کہ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (30:31) دیکھنا! کہیں تم مشرکین میں سے نہ ہو جانا! اس سے زیادہ واضح اور کھلی ہوئی آیات کیا ہونگی!

مسلمانوں میں مختلف فرقہ وارانہ شاخوں کی تفصیل

اب آپ کے ہاں کیفیت یہ ہے کہ فرقے کی نسبت کے بغیر آپ اپنے آپ کو مسلمان بتا ہی نہیں سکتے۔ جس سے ملیے' تعارف کرایئے' یہ پوچھیے کہ صاحب! آپ کون ہیں؟ جی مسلمان ہوں۔ صاحب! یہ تو مجھے بھی پتہ ہے' اس سے کیا کام

چلتا ہے' بتاؤ کہ تم کون سے مسلمان ہو؟ اس کے بعد شیعہ سنّی تک ہی بات ختم نہیں ہوجاتی' وہ تو درخت کے پہلے دو ٹہنے تھے' سنّی ہو؟ پھر آگے یہ ہوا کہ اہل حدیث ہیں یا اہل فقہ ہیں صاحب؟ وہ اہلِ فقہ ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ان کی شریعت کیا ہے؟ اس کے بعد یہ ہوا کہ آپ کیا ہیں: مالکی' حنبلی' شافعی' حنفی؟ کہا کہ حنفی مسلمان ہیں جی۔ کہا کہ او جی! حنفی تو ہوا مگر یہ تو بتاؤ کہ آپ دیوبندی ہیں یا بریلوی ہیں؟ بریلوی ہوئے صاحب! پھر پوچھا کہ بتایئے کہ آپ نقشبندی ہیں' چشتی ہیں' قادری ہیں' نظامی ہیں؟ عزیزانِ من! مسلمان کہلانے سے کسی کا اطمینان ہی نہیں ہوتا۔ قرآن حمید کہتا ہے کہ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ (22:78) خدا نے تمہارا نام مسلمان رکھا تھا ''کیندے نیں اوس طراں ای جیویں بچپن اچ مینوں کاکا کیندے ہوندے سن' ناں تے میرا کچھ ہور سی۔ اوتے میں چھوٹا ہوندا سی جدوں مینوں کاکا کیندے سن' ہن تے میں وڈا ہو گیا واں' ہن مینوں شرم آندی اے' ہن مینوں تسی سنّی کہو' تے حنفی کہو' فقہی دیوبندی کہو' بریلوی کہو' نقشبندی کہو' گل ہوئی نا کوئی'' (اسی طرح کہتے ہیں جس طرح عالمِ بچپن میں مجھے ''کاکا'' کہتے تھے۔ نام تو میرا کچھ اور تھا۔ وہ تو میں چھوٹا سا تھا جب مجھے ''کاکا'' کہتے تھے۔ اب تو میں بڑا ہو گیا ہوں۔ اب مجھے شرم آتی ہے۔ اب مجھے آپ سنّی کہیں' فقہی دیوبندی کہیں' بریلوی کہیں' نقشبندی کہیں۔ اب یہ بات ہوئی نا!)۔ قرآنِ مجید کہتا ہے کہ سنو! هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ۙ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا (22:78) اور نئی بات نہیں ہے' پہلے بھی جو ہمارے اسلاف تھے' ہم مسلمان ہی کہا کرتے تھے' تمہارا نام بھی ہم نے مسلمان ہی رکھا ہے۔ کہا ہے کہ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (30:31) دیکھنا! کہیں مشرکین میں سے نہ ہوجانا۔

برادرانِ عزیز! یہ کیا تھے اور کیا ہو گئے۔ پھر اور آگے چلیے شرک کی وہ کیفیت بھی ہے جو غیر مرئی ہے۔ یہ تو شرک کی مرئی صورتیں ہیں' یہ شرک کی محسوس شکل ہے جو تمہارے سامنے رکھے ہوئے بت ہیں۔ انہیں تو انسان دیکھ لیتا ہے کہ وہ بت ہیں۔ ایک شرک کی غیر مرئی شکل بھی ہے جس کے متعلق اقبالؒ (1877-1938ء) نے کہا تھا کہ

بیاں میں نقطۂ توحید آ تو سکتا ہے
ترے دماغ میں بت خانہ ہو تو کیا کہیے

یہ شرک ہے اندر کے بت کو اپنا الٰہ ماننا' اسی کے مطابق اپنے آپ کو اس کا محکوم بنالینا۔

اپنے اپنے جذبات وخواہشات کی پیروی نے الٰہ کے قرآنی مفہوم کو ہی نظر انداز کر دیا ہے

یہ جو اندر کا بت خانہ ہے' قرآن مجید کہتا ہے کہ اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ (45:23) تم نے اس مشرک کو بھی دیکھا' جس نے ''اپنے جذبات اور خواہشات کو ہی اپنا معبود بنالیا''۔ عزیزانِ من! آج اس شرک سے کون بچا ہوا ہے؟ کوئی نہیں۔ ہر ایک نے اپنے مفاد کو' اپنی خواہشات کو ہی اپنا الٰہ بنالیا ہے۔ اب یہاں جو آپ نے الٰہ لفظ دیکھا' اس سے بات سمجھ میں آئی کہ جو لا الٰہ کہنے والا ہے' وہ کیا کہتا ہے' وہ کس کس الٰہ کے گلے پہ چھری پھیرتا ہے اور جب ہم نے اس کا ترجمہ صرف معبود کرلیا کہ جس کی پرستش کی جاتی ہے اور پرستش کے معنی اتنی سی بات ہوگئی تو توحید اور شرک کا وہ سارا مفہوم ہی

ذہن سے غائب ہو گیا۔

الٰہ کے تو معنی ہیں ''جس کی مانی جائے'' اور تم ہو کہ اس کے احکام وقوانین کے سامنے' پھر بھی اپنی مانتے ہو تو مشرک ہو۔ کہا ہے کہ اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ (45:23) ایک تو وہ جہالت تھی کہ علم نہیں تھا تو اس صورت میں کسی جہالت میں پہنچ گئے۔ یہ بت پرستیاں وغیرہ جہالت کے دور کی چیزیں ہیں' کہا ہے کہ یہ وہ ہے کہ علم کے باوجود اندھا ہے کیونکہ وَّخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً (45:23) آنکھوں میں پردے ہیں' کانوں میں ڈاٹ ہیں اس کی کیفیت یہ ہے کہ دل پہ مہریں لگا کر بیٹھا ہوا ہے۔ لاکھ سمجھاؤ' لاکھ سمجھانے کی کوشش کرو' بات آگے چلتی ہی نہیں ہے۔

خالصتاً جذباتی زندگی کے قید خانے میں گرفتار انسانی نفسیات کی حالتِ زار

یہ صرف اس لیے ہے کہ یہ حیوانِ ناطق ہے' جذبات کے تابع آیا ہوا ہے' اپنے جذبات میں مدہوش ہو چکا ہے۔ آپ میں اس معاشرے کے اندر کون ہے جسے یہ پتہ نہیں ہے کہ یہ بدنظمیاں' یہ قانون شکنیاں' یہ رشوتیں' یہ بدعنوانیاں تباہی کی طرف لے جا رہی ہیں۔ پھر کیا ہو رہا ہے کہ اس کے باوجود وہ راہِ راست پہ نہیں آتا؟ اس لیے کہ اس نے اپنے جذبات کو اپنا الٰہ بنا رکھا ہے۔ قرآن حکیم کہتا ہے کہ اس کے باوجود یہ لوگ ہیں' جو اندھے ہوتے ہیں۔ اور وہ مقام ہے جہاں کہا ہے کہ فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ (45:23) جو اپنی یہ کیفیت پیدا کر لے' اس کے بعد اس کو راہِ راست پر کون لا سکتا ہے۔ یہ اپنے ہی جذبات کو الٰہ بنا لینے والے ہیں۔ پھر ان کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے۔ عجیب انداز میں قرآن کریم کہتا ہے۔

قرآن کریم سے انسان کتنا اوپر ہو جاتا ہے! مگر اس کے برعکس ان بتوں کا انسان' بزرگوں کے بت' احبار و رہبان کے بت' خواہشات کے بت' استبداد کی حکومتوں کے بت' جن کے ساتھ احتیاجیں وابستہ ہیں ان کے بت' یہ جب اتنے بتوں کا خوگر ہو جائے پھر اس انسان کی کیفیت کیا ہوتی ہے؟ محسوس شکل میں اگر کسی ایک شخص کی آپ نے یہ کیفیت دیکھنی ہو تو دیکھیے اُسے جو اِن قبروں پہ جاتا ہے' پیر پرستیاں کرتا ہے 'قلندر حق چہ گوید دیدہ گوید' اس بدبخت کی شاعری میں شاید ہی ملک کی کوئی قبر ہو' جس کی مٹی اس کے ساتھ نہ لپٹی ہوئی ہو۔ کیفیت اس کی یہ ہوتی ہے کہ توحید کی' خدائے واحد کی بات اس سے کرو تو اس کی وہ عجیب اضطرابی کیفیت ہوتی ہے کہ کیا بات لے کر بیٹھ گیا اور جونہی اس کے سامنے اس کے حضرت صاحب کی بات کی تو کہا کہ سبحان اللہ صاحب! بات ہوئی صاحب! حضرت صاحب کا مقام کیا ہے' اب اس بات کو صاحب آپ پہچانے ہیں' باچھیں کھل جاتی ہیں۔ قرآنِ حکیم کہتا ہے کہ وَاِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَاَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ ۚ (39:45) یہ جو اللہ اور آخرت سے' مکافاتِ عمل سے' انکار کرنے والے ہیں جب اکیلے خدا کا ان کے سامنے ذکر کرو تو منہ بسور لیتے ہیں' ماتھے پہ شکنیں پڑ جاتی ہیں' تنگ آ جاتے ہیں کہ جلدی سے یہ بات ختم کرو اور اس کے ساتھ کہا ہے کہ وَاِذَا ذُكِرَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ (39:45) اور اس کے ساتھ جب حضرت صاحب کا ذکر کر دیا'

خوش ہوجاتے ہیں' صاحب! سبحان اللہ' سبحان اللہ' جی سبحان اللہ۔قرآن کریم کہتا ہے کہ یہ اکیلے خدا کا ذکر نہیں سن سکتے' جب اس کے ساتھ ان کا ذکر کرو تو بڑے خوش ہوجاتے ہیں۔

عزیزانِ من! اس کے ساتھ ہی دو تین آیتیں اور بھی لے لیجیے' بڑی اہم چیزیں ہیں۔کہا ہے کہ ذٰلِكُمْ بِاَنَّهٗٓ اِذَا دُعِيَ اللّٰهُ وَحْدَهٗ كَفَرْتُمْ (40:12) وہ اس لیے کہ جب اکیلے خدا کی توحید کی طرف تمہیں دعوت دی جائے تو اُس سے انکار کرتے ہیں۔وَاِنْ يُّشْرَكْ بِهٖ تُؤْمِنُوْا ۭ (40:12) اس کے ساتھ اور شریک کر دیئے جائیں تو پھر خدا پر ایمان لاتے ہیں' وہ خدا' جس سے متعلق حضرت صاحب ہیں' یہ خدا ان کی نسبت سے پہچانا جاتا ہے' اس پر ان کی نسبت سے ایمان لایا جاتا ہے۔

یورپ میں پرچار کے سلسلہ میں ایک مولوی صاحب کی ناکامی کی بنیادی وجہ

ایک لطیفہ مشہور ہے کہ ایک مولوی صاحب تھے۔وہ یورپ میں گئے۔انہوں نے جا کر خدا کا پرچار شروع کیا' دعوت دینی شروع کی' کسی نے پوچھا ہی نہیں وہ تھک کر چلا آیا' آ کر اس سے پوچھا کہ بتاؤ ذکر کیا؟ کہنے لگے کہ صاحب! میں وہاں خدا کا ذکر کرتا رہا' کسی نے میری بات ہی نہیں سنی۔کہنے لگے کہ تمہیں پتہ نہیں' چلو' میں تمہیں بتاتا ہوں کہ کس طرح خدا کی بات نہیں سنتے! اس کے پاس پتہ نہیں کیا فن ہے' وہ آیا' اس نے آ کر جگہ جگہ حضرتِ مسیحؑ کی منادی شروع کر دی اور مسیح کی منادی ہوئی۔اس پہ لاکھوں لوگ اس کے پیچھے آئے۔تب اس نے کہا کہ تمہیں معلوم ہے کہ مسیح کس کا بیٹا تھا؟ وہ خدا کا بیٹا تھا۔مسیح کے باپ کی حیثیت سے خدا کو پیش کرو' تب خدا کو مانیں گے' براہِ راست پیش کرنے سے کون مانتا ہے اور یہی ہے وہ فریب جو دیا جاتا ہے کہ ان کی وساطت سے ہم خدا تک پہنچتے ہیں۔قرآن حمید کہتا ہے کہ وَاِنْ يُّشْرَكْ بِهٖ تُؤْمِنُوْا ۭ (40:12) انہیں ساتھ ملاؤ تو پھر یہ خدا پر ایمان لاتے ہیں۔

قرآنِ حکیم کی رُو سے محکومیت فقط قوانینِ خداوندی کی اختیار کرنا ہے

اسی آیت کے آگے یہ ہے جس نے اس شرک کی جڑ کاٹ دی ہے۔کہا ہے کہ فَالْحُكْمُ لِلّٰهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيْرِ (40:12) محکومیت اختیار کرنی ہے تو تم صرف اس کی اختیار کرو جو بڑے ہی بلند مرتبے کا' بڑی قوتوں کا مالک ہے' تمام فیصلے اسی کے قوانین کے مطابق ہوتے ہیں۔اس میں کسی اور کا قانون شریک نہیں ہوتا' اس کی حکومت میں کوئی شریک نہیں ہوسکتا اور تم ہو کہ ان کو مان کر' مسیح کے باپ کی حیثیت سے' اِن کی نسبت سے' اسے خدا مان رہے ہو حالانکہ کہا یہ ہے کہ فَالْحُكْمُ لِلّٰهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيْرِ (40:12)۔

توحید کی بنیاد پر خدا کو ماننے والی شخصیت حضرت یوسفؑ کی ذات کا ذکر

عزیزانِ من! یہی ہے وہ توحید جو حضرتِ یوسفؑ نے قید خانے میں پیش کی تھی۔توحید کا ماننے والا کسی موقعہ کو بھی اپنے ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔یہ بڑی عجیب چیز ہے' سورۃ یوسف پہ آؤنگا تو میں عرض کرونگا۔یہ قید خانے میں بھی ہیں۔انہوں

نے دیکھا کہ دو قیدی اپنا مطلب لے کر آئے ہیں۔ یہاں بھی جسے ہم خدا کا بندہ کہتے ہیں' موقعہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ وہ کہتا ہے کہ یہ بات تو آپ اپنی لے کر آئے ہیں' اس کے لیے تو یہ ٹھہریں گے ہی' اس سے پہلے ان کو خدا کی بات تو سنا دو۔ اور وہ خدا کی بات کیا ہے؟ یہ کہ فرعون کا نظام ہے' اس کی مملکت میں بیٹھے ہیں' اس کے جیل خانے کے اندر پڑے ہوئے ہیں' یہ جو دونوں قیدی ہیں' یہ اس کے ملازم ہیں جو بات پوچھنے کے لیے آئے ہیں۔ یہ ان قیدیوں سے کہہ رہے ہیں کہ یٰصَاحِبَیِ السِّجْنِ (12:39) اے میرے قید خانے کے ساتھیو! آپ نے اندازہ لگایا کہ انہوں نے اپنے آپ کو بڑا اونچا مقام نہیں دیا' عزیزانِ من! قرآن کریم کے یہ مقام بڑے غور طلب ہوتے ہیں۔ یہ نہ کوئی مساجد والے بنے ہیں' نہ کوئی بڑے مولوی صاحب بنے ہیں' نہ کوئی اونچے مقام پہ کھڑے ہوئے ہیں۔ کہا یہ کہ اے میرے قید خانے کے ساتھیو! جیسے تم قیدی' ویسے ہی میں قیدی' آہاہا! یہ کتنی پیاری چیز ہے کہ اے میرے قید خانے کے ساتھیو! بات اتنی سی ہے کہ سوچو کہ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَیْرٌ اَمِ اللّٰہُ الْوَاحِدُ الْقَھَّارُ (12:39) ایک شخص صرف ایک آقا کا نوکر ہے اور وہ آقا بھی ایسا ہے جو ہر قسم کے اختیارات رکھتا ہے اور دوسرا شخص بیک وقت بیس مالکوں کی نوکری کرتا ہے۔ تم یہ بتاؤ کہ ان میں سے کس کی زندگی اچھی طرح سے گزرے گی؟ اتنی سی بات تو تم بھی جانتے ہو کہ کسی ایک شخص کی ملازمت کر لینا ان بیس مالکوں کے ملازم ہو جانے سے بہتر ہوتا ہے۔

ظاہر ہے کہ اُس کی زندگی بہتر ہوگی جو ایک آقا کا ملازم ہے اور وہ اس کی تمام ضروریات پوری کرتا رہتا ہے۔ یہ کیسی بات ہے! یہ انہی کی سطح پہ سمجھا رہے ہیں۔ دس بیس کا نوکر ہو کر ذرا بتائے کہ اس کے ساتھ کیا تماشا ہوتا ہے۔ وہ ملازم کہتا ہے کہ میں یہاں کیسے کام کر سکتا ہوں' میری تو مت ماری جاتی ہے۔ اس میں پھر ہوتا یہ ہے کہ ''بی بی جی کچھ کیندیاں نیں' کا کا کچھ کیندا اے' اے میاں جی کچھ آواز دین ڈیا ہیگا'' (بی بی کچھ کہتی ہیں' بچہ کچھ کہتا ہے اور یہ میاں جی ہیں کہ کچھ اور ہی آواز دے رہے ہیں)۔ کہا ہے کہ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَیْرٌ اَمِ اللّٰہُ الْوَاحِدُ الْقَھَّارُ (12:39)۔ کتنی عمدہ بات تھی جو ان کی سمجھ میں آئی۔ کہا ہے کہ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِہٖٓ اِلَّآ اَسْمَآءً سَمَّیْتُمُوْھَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُکُمْ (12:40) بس یہی صورت ایک اطاعت کرنے والوں کی ہے' یہ اس ایک کو چھوڑ کر جن کی تم محکومی اختیار کرتے ہو' یہ تو ایکٹرز (اداکار) ہیں' پردے کے پیچھے جا کر دیکھو یہ وہی چور کا چور ہے' پردے کے باہر آیا ہے تو بادشاہ بنا ہوا ہے جناب! وزیر بنا ہوا ہے۔ تم نے ان ایکٹرز کے کچھ نام رکھ لیے ہیں' کچھ تمہارے باپ داداؤں نے رکھ لیے۔ یہ حضرت صاحب چھ سو صدی پہلے تک تو کچھ نہیں تھے' آج تم نے ان کے کچھ نام رکھ لیے ہیں' ان مختلف آقاؤں کو اپنا خدا بنا لیا ہے۔

قرآنِ حکیم نے ان میں سے کسی کو کوئی سند نازل نہیں کی

صرف نام رکھے ہوئے ہیں' ان میں سے کوئی ایسا نہیں ہے جو فی الواقعہ کسی اقتدار و اختیار کا مالک ہو۔ کہا ہے کہ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰہُ بِھَا مِنْ سُلْطٰنٍ (12:40) خدا نے ان کے اختیار و اقتدار کے لیے کوئی سند نہیں نازل کی۔ اختیار تو اس کا ہے' جو کسی کو اپنا اقتدار اور اختیار تفویض کر دے اور کسی کو سند دیدے تو پھر بھی یہ بات ہو جائے کہ ہاں صاحب! ذاتی نہیں' اضافی

طور پہ ہی سہی' کوئی اختیار اُسے حاصل ہے۔ وہ کہتا ہے کہ خدا نے تو اس کی بھی کوئی سند نازل نہیں کی۔ اور تم ہو کہ کبھی غور ہی نہیں کیا کہ ان آقاؤں کی' ان خداؤں کی' حقیقت کیا ہے اور اصلیت کیا ہے؟ یہ بس اتنی ہی ہے کہ محض چند نام ہیں جو تم نے اور تمہارے آباؤ اجداد نے رکھ چھوڑے ہیں۔

کیا آدم یا انسان زمین پر خدا کا خلیفہ ہے؟

وہ جو آپ کے ہاں ایک عام چیز ہے کہ آدم یا انسان زمین پر خدا کا خلیفہ ہے۔ خلیفہ کے معنی ''نائب'' کے ہیں کہ اس کی جگہ وہ اس دنیا میں خدا ہے حالانکہ وہ کہتا ہے کہ وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ (57:4) تم جہاں ہو' میں وہاں ہوں۔ عزیزانِ من! نیابت بھی نہیں' تفویض بھی نہیں' اس کا سوال ہی نہیں۔ اور یہ ہے توحید۔ کہا ہے کہ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (12:40) حقِ حکومت خدا کے سوا کسی کو حاصل نہیں ہے۔ عربی جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ ''اِنِ الْحُكْمُ'' کے بعد جو ''اِلَّا'' آیا ہے' اس کے کیا معنی ہیں۔ یہ یک لخت' ہر ایک کو خدا کے سوا کاٹ دینے کا طریق ہے۔ یہ انداز ہے کہ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (12:40)۔ اب یہاں کہا ہے کہ حکم چلانے کا' حکومت چلانے کا حق' خدا کے سوا کسی اور کو نہیں ہے۔ آپ دیکھیے عبادت کے معنی کیسے واضح ہوتے ہیں! امر' حکم اس نے ہی دیا ہے کہ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ؕ (12:40) اس کے سوا کسی کی حکومت جائز نہیں' حکومت کا حق صرف اس کا ہے' اس کے سوا کسی اور کی محکومیت اختیار نہ کرو' اور نہ ہی یہاں اس کے معنی پرستش کیجیے' بات ہی نہیں بنتی' لفظ عبادت لے آیئے بات صاف ہو جاتی ہے۔ کہا ہے کہ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ (12:40) یہ ہے دینِ قیم۔ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (12:40) مشکل یہ ہے کہ لوگوں کی اکثریت اس حقیقت کو نہیں جانتی۔ وہ عبادت کو پرستش جانتی ہے' الٰہ کو معبود سمجھتی ہے۔ یہ جو کہا ہے کہ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (12:40) تو کہتے ہیں کہ اس کی بادشاہت آسمانوں کے اوپر ہے' حالانکہ اس نے کہا تھا کہ وَهُوَ الَّذِيْ فِي السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّفِي الْاَرْضِ اِلٰهٌ (43:84) آسمانوں میں بھی وہی حاکم ہے اور زمین پہ بھی وہی حاکم ہے۔

میں قرآنی آیات کا مفہوم قرآن حکیم ہی کی سند کے بغیر پیش نہیں کرتا: پرویزؒ

عزیزانِ من! یہ تھا شرک۔ اب کہا ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ (4:48) یاد رکھو! سہو و خطا سے کوئی لغزش ہو جانا اور بات ہے' اُس کے نقصانات سے انسان قانونِ خداوندی کے مطابق محفوظ رہ سکتا ہے لیکن جو شخص خدا کے قوانین کے ساتھ انسانوں کے خود ساختہ قوانین کو شامل کرتا ہے' شرک کرتا ہے تو اس روش کے تباہ کن نتائج سے کہیں پناہ نہیں مل سکتی' یہ نقصان جو وجہ تذلیلِ انسانیت ہے' وہ اس سے پہنچتا ہے۔ عزیزانِ من! یہ الفاظ یا مفہوم میرا اپنا نہیں ہے۔ اللہ کا فضل ہے' میں جو مفہوم عرض کرتا ہوں' وہ قرآن حکیم ہی کی کسی نہ کسی آیت سے ماخوذ ہوتا ہے' اسی شمعِ نورانی کی یہ کڑیاں ہوتی ہیں۔ کہا ہے کہ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ (22:31) یاد رکھو! جو بھی خدا کے ساتھ کسی اور کو شریک

کرتا ہے' حقِ حکومت دیتا ہے' اس کے سامنے جھکتا ہے' اس کی محکومیت اختیار کرتا ہے' انسان بھی ایسا کرتا ہے' یہ سمجھو کہ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ (22:31) یوں سمجھو جیسے وہ آسمان کی بلندیوں سے زمین کی پستیوں پہ آ گرا ہے۔ وہ آ گرا ہے تو اس سے خدا کا جو تختِ حکومت ہے' اس کا پایہ نہیں ہل جاتا۔

شرک کا عمل تو انسان کو آسمان سے زمین پر اس طرح گرا دیتا ہے جس طرح کوئی چڑیا کا نوزائیدہ بچہ گھونسلے سے زمین پر آ گرے

عزیزانِ من! اس سے بڑی بھی کوئی ذلت ہے کہ ایک انسان دوسرے انسان کے سامنے گڑگڑا رہا ہے۔ کہا ہے کہ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ (22:31) ایسے شخص کی مثال یوں سمجھو کہ آسمان کی بلندیوں سے زمین کی پستیوں پر آ گرا تو اس انداز سے جیسے ایک چڑیا کا نوزائیدہ بچہ اپنے گھونسلے سے زمین کے اوپر آ گرے۔ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ (22:31) اور ایک چیل آئے اور جھپٹ کر لے جائے۔ دیکھتے ہیں آپ شرک کے نقصانات' پھر جس کا پنجہ ذرا سخت ہو' جس کے ناخن تیز ہوں' وہی اس کو لے جائے۔ آسمان کی بلندیوں سے گرا تو اس طرح گرا جیسے چڑیا کا نوزائیدہ بچہ گرتا ہے' جس میں اڑنے کی بھی ہمت نہیں ہوتی پھر جو زیادہ تیز پکڑنے والا پہلے آ گیا تو وہی لے کر اڑ گیا اور اگر وہ نہ بھی آیا اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ (22:31) تو ہوا کا کوئی تیز جھونکا' خس و خاشاک کی طرح اس کو اڑا کر لے گیا۔ صاحب! شرک یہ ہے۔

شرک کے بعد اسبابِ زوالِ امت پہ انکوائری کمیشن کیوں؟ خدا کے قانونِ حیات کے ماوراء نظام قائم کرنے سے انسان روٹی کے لیے بھی بھیک مانگتا ہے۔

عزیزانِ من! اس کے بعد آپ پھر اپنے ہاں انکوائری کمیشن بٹھاتے ہیں کہ وہ اسبابِ زوالِ امت کی تحقیق کریں کہ ہماری یہ حالت کیوں ہے۔ شرک میں جو گرفتار ہے' کیا وہ کسی عزت کا مالک ہو سکتا ہے؟ نہیں۔ قطعاً نہیں۔ یہ انفرادی چیز نہیں ہے۔ پھر اس قسم کے نظام قائم کر دیئے جاتے ہیں کہ اس کے بعد فرد کو اس کے سوا مفر نہ رہے کہ وہ روٹی کے لیے بھی بھیک مانگے اور جب روٹی کے لیے بھیک مانگے تو جو جی چاہے' اس سے منواتے چلے جایئے' پھر اس کی حکومت بھی قائم ہو جائے گی۔

کوئی حکومت بھی اپنے استبداد کو مذہبی پیشوائیت کے بغیر قائم رکھ ہی نہیں سکتی

فرعون کی فرعونیت اس دعوے کے اندر تھی کہ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى (79:24) میں تمہارا اَن داتا ہوں' میں تمہاری پرورش کرتا ہوں۔ کس طرح سے انسان اس ذلت کے لیے تیار ہو جاتا ہے' اس کے لیے ہامان ساتھ رکھا ہوا تھا' اس نے اپنے ساتھ پروہت رکھا ہوا تھا' اس کے جنود تھے' اس کے لاؤ لشکر ساتھ رکھے ہوئے تھے' وہ صبح شام اس کے کان بھرتے تھے کہ یہ خدا جس کو تم مانتے ہو' یہ اس دنیا کے اوپر اس کا اوتار ہے۔ وہ صبح شام ان سے یہ کہتے تھے' ان کو معبود بناتے تھے۔ حکومت کا

استبداد کبھی بھی مذہبی پیشوائیت کے سہارے کے بغیر نہیں چل سکتا اور ان دونوں سے پھر وہ نظام قائم ہوتا ہے جس کا نمائندہ قارون ہے۔ بس یہ تین چیزیں ❶ اکٹھی کر لیجیے' اس کے بعد کسی اور چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کو توڑنے کے لیے کسی صاحبِ ضربِ کلیم کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ شرک کو آ کر توڑتا ہے' یہ توحید کا نظام راسخ کرتا ہے کہ کوئی انسان اپنی روٹی کی خاطر کسی دوسرے انسان کا محتاج نہیں ہوتا اور جب محتاج نہیں ہوتا تو محکوم نہیں ہوتا۔ کہا ہے کہ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰٓى اِثْمًا عَظِيْمًا (4:48) خدا کے ساتھ شرک کرنے والے کے لیے پہلی چیز تو یہ ہے کہ یہ حقیقت کے خلاف ہے' کسی کو یہ اختیار حاصل نہیں کہ دنیا میں کسی انسان کو اپنا محکوم بنائے' جو یہ دعویٰ کرتا ہے' وہ افتراء ہے' وہ خود وضع کرتا ہے۔ یہ عجیب الفاظ ہیں صاحب! اور نتیجہ یہ ہے کہ اِثْمًا عَظِيْمًا (4:48) ہمارے ہاں تو ترجمہ کیا جاتا ہے کہ یہ بڑا گناہ ہے' اس طرح ہمارے ہاں اس کا تو مفہوم ہی کچھ اور ہو گیا ہے۔

اثم کا لغوی مفہوم ''اپنی صلاحیتوں کا مضمحل ہو جانا یا کمزور ہو جانا ہے''

میں نے شاید پہلے بھی کئی دفعہ عرض کیا ہے کہ عربی زبان کے اندر اثم کہتے ہیں ''جب کسی کی توانائیاں اتنی مضمحل ہو جائیں کہ وہ صفِ انسانیت کے ساتھ چلنے کے قابل نہ رہے''۔ آیت (4:48) کے آخری الفاظ میں قرآن کریم نے یہ کہا ہے کہ غیروں کے محتاج ہو جاؤ' ان کی محکومی اختیار کر لو' پھر تم دیکھو کہ اس قوم کے اوپر کتنی اضمحلال اور فرسودگی چھا جاتی ہے' پھر اس قوم کے ذہن میں ایک ہی بات آتی ہے کہ یہاں سے بھیک مانگو' وہاں سے قرضہ لو' وہاں سے یہ چیز لو۔ وہ قوم اس قدر مضمحل مزاج ہو جاتی ہے' اس قدر ناکارہ ہو جاتی ہے کہ وہ محنت سے چنے چبا کر گزارہ نہیں کرنا چاہتی۔ جہنم کی جو روٹی ہے اس کے متعلق قرآن کریم نے یہ کہا ہے کہ سمندر کا پانی جو خس و خاشاک اور جھاڑ جھنکار کو ساحل پر پھینک دیتے ہیں' وہ اہلِ جہنم کا کھانا ہوتا ہے۔ وہ پھر یہ کھانا کھاتے ہیں' مست ہو جاتے ہیں' پھر اپنی خوشحالیوں کے قصے سناتے ہیں۔ یہ ہے اِثْمًا عَظِيْمًا (4:48)۔ کہتا ہے کہ اس قوم کے اندر توانائیاں مضمحل ہو جاتی ہیں۔ عرب ناقة الاثیمة اُس اونٹنی کو کہتے تھے جو تکان سے اس قدر مضمحل ہو جائے کہ باقی اونٹوں کے ساتھ چلنے کے قابل نہ رہے' اس لیے بہت آہستہ چلے' گھسٹتی ہوئی پیچھے چلی جائے۔ شرک کا یہ نتیجہ ہوتا ہے۔

عزیزانِ من! وقت ہو گیا۔ آج اللہ کا شکر ہے کہ بڑی اہم آیات تھیں جو ہمارے سامنے آئیں اور آگے پھر قرآنِ حکیم اس کی شقیں لاتا ہے کہ آؤ ہم جو روحانیت کے بڑے بڑے مدعی ہوتے ہیں' تمہیں ان کا بتائیں۔ یہ بات ہم اگلے درس میں لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (2:127)

---

❶ یہ تین چیزیں یہ ہیں: (1) فرعون: یہ استبدادِ ملوکیت کا مجسمہ ہے۔ (2) ہامان: یہ مذہبی پیشوائیت کا نمائندہ ہے۔ (3) قارون: یہ نظامِ سرمایہ داری کا نقیب ہے۔

راجہ عبدالعزیز (دھیرکوٹ، آزاد کشمیر)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

تیسری قسط

متحرک نفسیات

Dynamic Psychology

انسانی راہنمائی کے لئے خدا کی طرف سے جو اصول، اقدار اور قوانین بذریعہ انبیاء علیہم السلام ملے ہیں انہیں الدّین کہا گیا ہے۔ اور یہ مطلق ہوتے ہیں۔ یہ نہ اضافی ہوتے ہیں اور نہ قابل تغیر۔ ارشادِ خداوندی ہے۔ ''تمہارے لئے بھی دین کا وہی راستہ تجویز کیا گیا ہے جس کا حکم نوح علیہ السلام، ابراہیم علیہ السلام، موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام کو دیا گیا تھا اور یہ بھی کہا گیا تھا کہ اسی دین کو ہمیشہ قائم رکھنا، اس میں کوئی تفرقہ اور اختلاف پیدا نہ کرنا 42:13۔ یہ بنیادی دین تو ہمیشہ سے ایک ہی رہا ہے، البتہ اس پر عمل پیرا ہونے کے طریقوں میں انسانی ضروریات کے مطابق انبیاء علیہم السلام کے ذریعے تبدیلی ہوتی رہتی تھی۔ اب نبوت کی تکمیل کے بعد قرآن مجید ہی قیامت تک انسانی ہدایت وراہنمائی کا سرچشمہ رہے گا۔ اس کے اصول وقوانین غیر متبدل رہیں گے۔ لیکن انسانی زندگی کے اِرتقائی مراحل کی بدلتی ہوئی ضروریات وتقاضات کے مطابق ہر زمانے میں اسلامی نظامِ مملکت قرآنی اصولوں اور اسوہِ حسنہ ﷺ کے تحت اور باہمی مشورے سے جزئی قوانین وضع کرے گا۔ یہ جزئی قوانین قابل تغیر ہوں گے۔ اس طرح ''ثبات (Permanence) اور تغیر (Change) کے حسین امتزاج سے کاروان انسانیت، شاداں وفرحاں اپنی منزلیں طے کرتا ہوا آگے بڑھتا چلا جائے گا۔ یہی خود انسانی زندگی کا تقاضا ہے''۔ (مطالب الفرقان 1) اس طریقہ کار میں البتہ اس بات کی سختی سے ممانعت کی گئی ہے کہ ان جزئی قوانین کے اختلافات کو بطور دلیل پیش کر کے اصل دین کی بابت جھگڑا شروع کر دیا جائے 22:67، 5:48۔

اخلاق واقدار کے قرآنی موقف کو قدرے تفصیل سے پیش کرنے کا ایک مقصد تو اس حقیقت کو اجاگر کرنا تھا کہ قرآن کا بنیادی اصولِ اخلاقیت (اخلاقی قانون) خودمختار اور کلیۃً حجت ہے۔ ''یہ صرف میرے یا آپ کے لئے نہیں اور یہ اس لئے کہ یہ مشروط قانون نہیں، کسی ایسے مقصد یا غرض کے لئے نہیں جسے میں چاہوں تو اختیار کروں اور نہ چاہوں تو نہ کروں۔ اس قاعدے کو اپنے عمل کا اصول بنایئے جس کے بارے میں آپ دیانتداری سے یہ آرزو کر سکیں کہ تمام عاقلوں کے عمل کا عالمگیر قانون بن جائے (قرآن اور مسلمانوں کے زندہ مسائل۔ از ڈاکٹر برہان احمد) اخلاقی اقدار چونکہ خود مطلقاً حجت ہیں،

بالذات خیر ہیں مقصود بالخیر نہیں، غیر متبدل ہیں، ان کی حیثیت اضافی نہیں اور قانونِ مطلق ہیں اس لئے یہ خالق حقیقی کی طرف سے معروضی حیثیت میں ملتی ہیں۔ یہ موضوعی نہیں کیونکہ کوئی شخص یا سارے انسان بھی مل کر انہیں وضع نہیں کر سکتے۔ یہ حتمی ہیں اس لئے ان کی ماہیت میں اضافہ نہیں ہوسکتا۔ البتہ ان کی خلاف ورزی سے انسان ہر پہلو سے نقصان میں رہتا ہے۔ یہ اس لئے کہ اقدار محض نظریاتی نہیں ہوسکتیں، بلکہ جب تک کوئی نظریہ یا عقیدہ عمل میں تبدیل نہ ہوجائے یا عمل کی کسوٹی پر پورا نہ اترے وہ کسی فرد کی شخصی اقدار کے ضمن میں آ ہی نہیں سکتا۔ یہ تو ہم آگے چل کر دیکھیں گے کہ انسانی میلان طبع، رجحانات، رویے، جذبات، احساسات وعادات، سوچ وفکر اور دیگر انسانی محرکات اور اخلاقیات کا باہمی تعلق کیا ہے اور کیسا ہے۔ یہاں پر ہم دیکھتے ہیں کہ انسان، خصوصاً دانشور، فلاسفہ، سائنسدان اور ماہرین نفسیات، اخلاقیات کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟ اخلاقی اقدار کو موضوعی یا اضافی سمجھنے یا ان کی نفی یا جھٹلانے والوں کا ذِکر پہلے ہو چکا ہے۔ اب مختصر سا ذِکر اُن سکالروں کا بھی ہوجائے جو سماجی اور تمدنی زندگی میں مطلق اور ہمہ گیر (Universal) اصول واقدار ضروری سمجھتے ہیں۔

نفسیات کا علم جہاں ایک واحد فرد کے ذہنی وکرداری اعمال، حافظہ، سوچ، آموزش، عصبی نظام، دماغ، ذہانت اور دیگر محرکات کے بارے میں تجزیات وتجربات کرتا ہے وہاں وہ انسانوں کے باہمی معاملات میں بھی اپنا کردار ادا کرتا ہے اسے معاشرتی یا عمومی نفسیات کہا جاتا ہے۔ نفسیات کی طرح اخلاقیات کا تعلق بھی معاشرتی معاملات سے ہوتا ہے اس لئے ان کا آپس میں گہرا تعلق اور رابطہ ہوتا ہے۔ ابتداء میں چند نفسیاتی بیماریوں کا ذِکر ہوا تھا۔ ان بیماریوں کا اخلاقیات سے کس قدر گہرا رشتہ ہوتا ہے اسے علمائے نفسیات نے اپنی تحقیقات میں شامل کر کے تفصیل سے بیان کیا ہے۔ مثلاً نوفرائڈی فلسفے کے بانیوں میں ایرک فرام (Erich Fromm) کا نام مشہور ہے۔ اس کے بارے میں آگے چل کر بھی بات ہوگی، یہاں نفسیاتی عوارض اور اخلاقیات کے باہمی تعلق پر اس کا تجزیہ دیکھئے۔ وہ لکھتے ہیں ''نفسیاتی صحت اور نفسیاتی عوارض کا مسئلہ اخلاقیات کے ساتھ اس طرح وابستہ ہے کہ ایک کو دوسرے سے الگ کیا ہی نہیں جا سکتا۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہر نفسیاتی عارضہ کسی نہ کسی اخلاقی مسئلہ کا مظہر ہے'' ہیومن ازم'' کے ضابطۂ اخلاق کی رُو سے، انسانی ذات کی تکمیل ومحکمیت میں ناکامی، بجائے خویش اخلاقی ناکامی ہے۔ اس سے بھی زیادہ متعین الفاظ میں، نفسیاتی عوارض کسی نہ کسی اخلاقی مسئلہ کے مظاہر ہوتے ہیں اور نفسیاتی علامات، اخلاقی کشمکش کے حل نہ کرنے کا نتیجہ (Man for him self)۔ یہ ذہن میں رکھئے کہ یہ ماہر نفسیات ہیومینیٹیرین ہے وحی کا قائل نہیں۔ اس کے باوجود یہ ماہرین نفسیات میں پہلا شخص ہے جس نے انسان اور کائنات کے بنیادی رشتے کا سوال اٹھایا ہے۔

مغربی مفکرین اور علمائے نفسیات نے اخلاقیات پر بہت کام کیا ہے ان میں 'R.A.P.Rogers' نے تاریخ اخلاقیات کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے جس میں قدیم یونانی فلاسفہ سے لے کر موجودہ دور کے جدید فلسفیوں تک، اکثر مشہور مفکرین کے اخلاقیات کے بارے میں نظریات بیان کئے گئے ہیں۔ راجرز نے اخلاقیات سے متعلقہ کچھ سوالات ابتداء ہی

میں اٹھائے ہیں اور کہا ہے کہ اخلاقیات ان سوالوں کو حل کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ (1) کیا مسرت عمل کی انتہائی غایت ہے۔ (2) کیا نیکی لذت کے مقابلے میں قابل ترجیح ہے۔ (3) لذت و مسرت میں فرق کیا ہے۔ (4) اس کے کیا معنی ہیں کہ مجھے فلاں کام کرنا چاہئے یا فلاں اصول مثلاً ایفائے عہد وغیرہ کا احترام کرنا چاہئے۔ (5) کیا مجھ پر کوئی ایسی ذمہ داری ہے کہ میں دیگر افراد کے لئے بھی کوشش کروں اور اپنی غایت کے لئے بھی اگر ایسا ہے تو ان دونوں غایتوں کا صحیح تناسب کیا ہے۔ (7) اختیار و ارادہ کے کیا معنی ہیں۔ (8) احساس و عقل میں سے کردار کا صحیح راہبر کون ہے (9) خیر، ثواب، فریضہ اور ذمہ داری کے نظری اور عملی طور پر کیا معنی ہیں؟ آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ اخلاقیات کے بارے میں جتنے بھی ممکن سوالات اٹھائے جا سکتے ہیں، راجرز کے اٹھائے گئے سوالات میں اصولی طور پر موجود ہیں۔ اس کے نزدیک اخلاقیات اس امر کو فرض کرتی ہے کہ اچھی اور بری غایتوں میں فی الحقیقت ایک امتیاز ہے۔ نیز یہ کہ اخلاقیات وہ علم ہے جو ان اصولوں کو دریافت کرتا ہے جن سے کردار انسانی کے اصلی غایات کی حقیقی قدر و قیمت کا تعین ہو۔ راجرز نے تاریخ کے مشہور فلاسفہ اور حکماء کے حوالوں سے اپنے سوالات کے جوابات دیئے ہیں۔

مثلاً سوفسطایہ اور پروٹاغورس وغیرہ کا کہنا ہے کہ خیر و شر کا معیار انسان خود ہے۔ لیکن سقراط اور افلاطون وغیرہ نے اس نظریے کی مخالفت کی ہے۔ ''سقراط یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ فضیلت اور فلاح انسانی غیر متغیر قوانین کے تابع ہے جو افراد کی ڈاواں ڈول پسند پر مبنی نہیں ہوتے۔ نیز یہ کہ ان قوانین کا انکشاف بھی ہو سکتا ہے اور ان کی ہم دوسروں کو تعلیم بھی دے سکتے ہیں''۔ سقراطی مذہب کے دو فرقے سرینیہ اور کلبیہ ہیں۔ سرینیہ کے بانی ارتس پس کے نزدیک لذت ہی مقصدِ حیات ہے یعنی لذت بخش احساسات ہی سعادت کا بڑا عنصر ہیں۔ جبکہ کلبیہ کے بانی انٹی ستیھینز عمل اور ضبط و تحمل پر زور دیتے تھے۔ وہ کہتا تھا کہ سب سے بڑی غایت یہ ہے کہ انسان فضیلت کے مطابق زندگی بسر کرے۔ سقراط کا دعویٰ تھا کہ اخلاقی فضیلت ایک طرح کا علم ہے۔ (نیکی علم ہے)۔ پلاٹو کے نزدیک عدالت روح کی فضیلت ہے۔ یہ اسی طرح روحانی حسن و تندرستی کا نام ہے جیسے کہ بدی روحانی قبیح اور بیماری کا نام ہے۔ اس کے مطابق عدالت کا اصلی جوہر داخلی و روحانی ہے۔ اس لئے افراد کی سیرت میں اس کا پایا جانا لازمی ہے۔ نیز یہ کہ خیر مطلق عقل کے ذریعے سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ لیکن اس کی نوعیت تمثیلاً ہی بیان کی جا سکتی ہے۔ (قرآن پاک کے مطابق یہ بھی ممکن نہیں کیونکہ اس کی کوئی مثال ہی نہیں 42:11)۔ ارسطو کے نزدیک جو افعال اخلاقی نقطہ نگاہ سے معمولاً اچھے ہوں وہ تسویقاً نہیں بلکہ عمداً ہوتے ہیں۔ اپیقورس نے سرینیہ کی اخلاقیات کو ایک مہذب اور اصلاح شدہ شکل میں پیش کیا۔ کلبیہ کا خیال تھا کہ فضیلت برترین خیر ہے اس کا حصول ہی مسرت اور سعادت کے مساوی ہے۔ رواقیہ نے اس نظریے کو ترقی بھی دی اور اصلاح بھی کی۔ زینو قبرصی اس فلسفہ فکر کا بانی تھا۔ نوافلاطونیت کے حکماء نے افلاطونی فلسفہ اور عبرانیوں کی اخلاقیات کو مخلوط کر کے ایک نئے مذہب کو پیش کرنے کی کوشش کی۔ آگسٹائن کی تعلیم تھی برترین خیر محبتِ الٰہی ہے۔

تھامس ہابز موجودہ غیر مذہبی اخلاقیات کا بانی ہے۔ اس کی طبعیات، نفسیات اور اخلاقیات یونانی فکر کی آزاد و بے غرضانہ

خصوصیت رکھتی ہیں۔ یہ ہابز ہی تھا جس نے واضح اور عام اعلان کیا کہ انسان کے لئے اپنی خیر کے علاوہ کسی دوسرے شخص کی خیر کے لئے سعی وجدوجہد کے واسطے کوئی محرک ہو ہی نہیں سکتا۔ اہل فطرت کے نزدیک اخلاقی تصورات ماخوذ نہیں یہ ایسی خواہشوں' احساسات یا جبلیات کے نتائج ہوتے ہیں جو کوئی اخلاقی مفہوم نہیں رکھتیں یہ قوانین میکانکی ہیں عقل ان کی راہنمائی نہیں کرتی۔ ہابز ان قوانین کو بقائے نفس اور اثبات نفس کی فطری جبلتوں سے اخذ کرتا ہے۔ ہیوم ان قوانین کو مختلف احساسات سے اخذ کرتا ہے اور ہربرٹ سپنسر اخلاقی تصورات اور اخلاقی ذمہ داری کو موروثی جبلتوں پر مبنی قرار دیتا ہے۔ یہ اہل فطرت کا نظریہ ہے۔ اس کے برعکس اہل وجدانیہ یہ کہتے ہیں کہ اخلاقی ذمہ داری' اخلاقی تصورات اور حقائقِ انسانی ناقابل تحلیل ہوتے ہیں۔ ان کی توجیہہ اس طرح نہیں ہوسکتی کہ یہ غیر اخلاقی قوتوں مثلاً ذاتی غرض' حیوانی جبلتوں یا محبت ولذت کے نتائج ہیں۔ وہ عموماً یہ کہتے ہیں کہ جزوی افعال کی اخلاقیت یعنی اخلاق کے اساسی اصول وجدانی طور پر معلوم ہوتے ہیں۔ نیز یہ بھی کہ اخلاق سے ابدی حقائق کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ اس نظریے کی تردید کرتے تھے کہ اخلاقی روایات محض باہمی معاہدات اور پیمانوں کا نتیجہ ہیں۔ وہ اس نظریے کو حقائق کے خلاف سمجھتے تھے۔ راجرز کے مطابق 19 ویں اور 20 ویں صدی میں اس تفریق کی شدت ختم ہوگئی ہے۔ اب ارتقائی مظہریت اور عقلی تصوریت کے درمیان مقابلہ ہے۔ نیز اب اس میں افادیت کا نظریہ بھی شامل ہوگیا ہے۔ یعنی بڑی سے بڑی تعداد کی زیادہ سے زیادہ مسرت۔ کانٹ کے نزدیک اخلاق کا تمام تر دارومدار انسان کے صاحبِ اختیار ہونے پر ہے کیونکہ اس کے بغیر تو اس کے کوئی معنی ہی نہیں ہوں گے۔ ہابز کی طرح بتیتھم بھی کہتا ہے کہ انسان صرف اپنی لذت ومسرت کے لئے کوشش کرسکتا ہے۔ یعنی سعی اور جدوجہد کے لئے انسان کے پاس اور کوئی قوتِ محرکہ ہے ہی نہیں۔

تھامس ہابز م1679ء مادیت پسند ہونے کے باعث قدر واختیار کا منکر ہے اور جبر مطلق کا قائل ہے۔ اس کے پیش کردہ ''سوشل کنٹریکٹ'' یا معاہدہ عمرانی میں یہی نظریہ پیش کیا گیا ہے۔ اس نے انسانی فعل اور اختیار میں عجیب اور منفرد فرق ظاہر کیا ہے۔ اس کے خیال میں انسان جس بات کا ارادہ کرتا ہے' اس پر عمل کرنے میں وہ آزاد ہے۔ لیکن ارادہ کرنے میں وہ مجبور ہے۔ بہرحال ہابز اور اس کے ہمنواؤں کا یہ کہنا کہ اپنی مسرت کے علاوہ اور کوئی انسانی جذبہ محرکہ ہے ہی نہیں' عقائد کی دنیا میں بڑی اہمیت کا حامل نظریہ ہے۔ یہ اس لئے کہ جدید عقائد مثلاً انسان دوستی (Humanitarianism) یا سیکولرازم وغیرہ کا یہ دعویٰ باطل ہوجاتا ہے کہ یہ مذاہب انسان کی بھلائی' اس کے مفاد اور اس کی فلاح وبہبودی کے لئے کوشاں ہیں۔ جبکہ اس نظریے کے مطابق یہ ممکن ہی نہیں کہ اپنی خوشی کے عوض دوسروں کی خوشی کی خاطر جان جوکھوں میں ڈالی جائے۔ ان نئے مذاہب کے مطابق چونکہ انسانی زندگی کا خاتمہ موت کے ساتھ ہی ہوجاتا ہے۔ انسانی ذات یا حیات بعد الممات کے یہ لوگ قائل ہی نہیں۔ اس لئے انسانی ہمدردی' انسانیت کے تقاضے' انسانی مفاد' انسانی بھلائی' انسانی ذمہ داری' انسانی جذبات وخواہشات بلکہ خود احترامِ انسانیت اور انسانیت کی خیرخواہی جیسے عقائد ونظریات پر عمل پیرا ہونے کے لئے ان کے پاس کوئی

بنیاد، محرک یا ترغیب (Incentive) ہے ہی نہیں۔ بلکہ مارکسزم کے بانی مارکس کے سامنے جب یہ سوال آیا کہ ایک انسان اپنی مشقت اور جان توڑ محنت کی کمائی دوسروں کی مسرت و بھلائی کے لئے کیوں دے تو اس کے پاس بھی اس کا جواب نہیں تھا۔ اِس کا تشفی بخش حل تو صرف وحی خداوندی کے پاس ہے اور یہ لوگ وحی کے منکر ہیں۔ اخلاقی ذمہ داری پر بحث کے دوران اکثر یہ اہم سوال پیدا ہوتا رہا ہے کہ کیا انسان پر کوئی ذمہ داری عائد ہوتی بھی ہے جس کے تحت وہ اپنی طمانیت و سعادت کی بجائے خارجی خیر کی تلاش و جستجو کرتا پھرے۔ یہ سوال اس طرح بھی ہے کہ میں ایسی خیر کی تلاش کیونکر کرسکتا ہوں جس کا تمام وکمال مجھ کو تجربہ نہیں ہوسکتا۔ دوسرے شخص کی خیر کا تجربہ اس کو ہوگا نہ کہ مجھ کو۔ اس لئے میرے عمل کے لئے تو اس کی خیر ایک ثانوی اور اکتسابی محرک ہوگی۔ جیسا کہ ہم نے اوپر دیکھا، اس بارے میں فلاسفہ متفق نہیں۔ مادئین اس قسم کی کسی ذمہ داری کو تسلیم نہیں کرتے بلکہ ناممکن سمجھتے ہیں۔ جبکہ مشاہبت پسند اسے تسلیم کرتے ہیں۔

گذشتہ قسط میں مادئین کا ذِکر ہوا تھا جو اخلاقی اقدار کو موضوعی اور اضافی سمجھتے ہیں۔ ان کے برعکس ایسے فلسفی اور سائنسدان بھی ہیں جو ان اقدار کو مطلق اور ہمہ گیر سمجھتے ہیں۔ جن میں چند فلسفیوں کا ذِکر ہو چکا ہے۔ ان کے نزدیک خیر و شر کی اپنی اپنی ناقابل تغیر خصوصیات ہوتی ہیں۔ مشہور فلسفی ریلف کڈورتھ جو آکسفورڈ میں افلاطونی فلسفے کا شارح تھا۔ وہ اس امر کا مدعی تھا کہ خیر و شر کی مقررہ نوعتیں ہوتی ہیں اور ان کا انحصار کسی رائے یا معاہدے پر نہیں ہوتا۔ پس اخلاقی امتیازات کا تصفیہ کسی انسان کی قوت یا ارادے سے نہیں ہوسکتا۔ ارادہ کسی شر کو خیر اور خیر کو شر اسی طرح نہیں کرسکتا جس طرح سیاہ کو سفید نہیں کیا جا سکتا۔ حتیٰ کہ خدا بھی ان میں تبدیلی نہیں کرتا۔ اقدار کی معروضی حیثیت کی پروفیسر الفرڈ کوبن نے یوں وضاحت کی ہے۔

"Complete way of life wich would be universal is neither present in human instinct, nor can be derived through human intelect. It can only come through revelation." (The crises of civilization).

پروفیسر راشڈل بھی ایسا ہی کہتے ہیں۔ ''اخلاقیات سے مفہوم ہی یہ ہے کہ دنیا میں اقدار کے لئے ایک مطلق معیار ہو جو ہر انسان کے لئے یکساں ہو یہ اقدار مستقل اور عالمگیر ہوں۔ ہر شخص فیصلہ نہ کرے کہ مستقبل اقدار کیا ہیں۔

(The Theory of good and evil)

اقدار کے بارے میں نظریہ اضافیت کے بانی اور مشہور زمانہ آئن سٹائن کی بات بھی اسی طرح غور طلب ہے جس طرح ان کی مساوات $E=mc^2$ ہے۔ وہ کہتے ہیں ''ہمیں تنہا عقل کو خدا نہیں بنانا چاہئے۔ عقل ذرائع اسباب پر تو خوب نگاہ رکھتی ہے۔ لیکن مقاصد اور اقدار کی طرف سے بالکل اندھی ہو جاتی ہے۔ سائنس مطلق اقدار متعین نہیں کرسکتی اور نہ ہی انہیں انسانی سینے کے اندر داخل کرسکتی ہے۔ یہ اقدار تجربات سے وضع نہیں ہوسکتیں بلکہ مقتدر ہستیوں کی وساطت سے ملتی ہیں۔ ان کی بنیاد عقل پر نہیں ہوتی لیکن وہ تجربہ کی کسوٹی پر پورا اترتی ہیں۔ کیونکہ صداقت کہتے ہی اسے ہیں جو تجربہ سے ثابت ہو''۔

(out of my later days)۔ڈاکٹر ژنگ کا بھی ایسا ہی خیال ہے۔ژنگ پر آ گے چل کر بات ہوگی۔

دنیائے محسوسات وطبعیات کی وسعت اور عمق کے متعلق ریڈنگ یونیورسٹی کے طبعیاتی ماہر ڈاکٹر جیمس آرنلڈ کروتھر کہتے ہیں۔''نظامِ فطرت اپنی گہری سادگی میں اس قدر تحیر انگیز ہے کہ دنیائے سائنس میں کسی موضوع پر حرفِ آخر' آخری انسان کے لئے ہی چھوڑنا پڑتا ہے''۔ (The great design)۔ڈاکٹر جیمز کی یہ بات انسانی نفسیات پر بھی صادق آتی ہے۔جیسا کہ ابتداء میں ذِکر ہو چکا ہے کہ قرآن پاک نے اپنی حقانیت وصداقت کے ثبوت میں عالم آفاق (خارجی کائنات) اور عالم انفس (انسان کی داخلی دنیا) کو پیش کیا ہے 41:53۔خارجی کائنات پر غور وتدبر' اس کے نظم وضبط اور قوانین کے متعلق سائنسی تحقیقات وتجربات انسانی تاریخ میں کافی عرصے سے جاری ہیں اور ان میں ہمارے دور تک کافی ترقی ہو چکی ہے۔لیکن انسانی نفسیات کے متعلق تحقیق کا سلسلہ ابھی حال ہی میں شروع ہوا ہے اس لئے اس تحقیق نے ابھی تک باقاعدہ سائنسی مسلمہ کی حیثیت حاصل نہیں کی۔تاہم کچھ ماہرین اب نفسیاتی علم کو سائنسی درجہ دے رہے ہیں۔اس علم کو بنیادی طور پر علم النفس یا سائیکالوجی (Psychology) کا نام دیا گیا ہے۔سائیکالوجی یونانی زبان کے دو الفاظ 'Psyche' اور 'Logos' کا مرکب ہے۔لفظ 'Psyche' یونانی لفظ 'Psukhe' سے ماخوذ ہے جس کا مطلب سانس یا روح ہے۔'Logos' کا مطلب لفظ' کلام یا منطق ہے۔لفظ لوگس (Logos) کی نفسیات سے ہٹ کر بھی اپنی ایک طویل تاریخ ہے۔ارسطو سے بھی پہلے یونانی فلسفی ہریقلیتس نے اس لفظ کو پہلی بار عقل کے مفہوم میں استعمال کیا تھا اور کہا تھا کہ یہ ہمہ گیر حرکت وہیجان بن کر کائنات میں سرایت کئے ہوئے ہے۔انا کساغورس نے اس واسطے کو عقل اول کا نام دیا تھا۔اس لفظ کو سب سے زیادہ فلو یہودی نے استعمال کیا۔اسے علم کلام کا ابوال آباء سمجھا جاتا ہے۔یونانیوں کی اکثریت اس بات کی قائل تھی کہ کوئی چیز عدم سے وجود میں نہیں آ سکتی۔اس لئے فلو نے لوگوس کا سہارا لے کر تکوین کائنات کے ذِکر میں کہا کہ لوگس خدا اور کائنات کے درمیان وہ ضروری واسطہ ہے جس کے بغیر کائنات کی تخلیق ممکن نہیں تھی۔

بہرحال ماہرین نفسیات نے لوگس کے لفظ کو نفسیات سے ہی منسلک کیا ہے۔قدیم زمانے میں چونکہ تمام علوم کو منطق قرار دیا جاتا تھا اس لئے سائیکالوجی سے مراد ''علم روح'' لیا گیا۔ماہرین کے مطابق اس علم کا ذِکر پہلی بار ارسطو نے اپنی کتاب 'De Anima' میں کیا ہے۔لیکن سائنسی حلقوں میں لفظ 'Psychology' کا استعمال دسویں صدی عیسوی کی یورپی کتابوں میں کیا گیا۔انگریزی زبان میں لفظ سائیکالوجی 1693ء میں پہلی بار استعمال ہوا۔لفظ سائیکالوجسٹ 1727ء اور سائیکالوجیکل 1776ء میں۔19ویں صدی کے وسط تک یہ الفاظ یورپی ممالک میں عام ہو چکے تھے۔لیکن برصغیر پاک وہند میں انگریزی علوم کے زیر اثر یہ الفاظ صرف پڑھے لکھے افراد تک محدود رہے۔قدیم دور میں نفسیات سے مراد علم روح تھا' لیکن یورپ کے جاگیردارانہ ماحول میں روح کے تصور نے ایک مذہبی رنگ اختیار کر لیا جو کہ علمی تقاضوں پر پورا نہیں اترتا تھا چنانچہ روح کی جگہ ذہن نے لے لی۔مگر یورپ میں جاگیردارانہ نظام کے خاتمے اور سائنس کا دور شروع ہونے کے بعد ذہن

کے تصور کو بھی غیر سائنسی قرار دے دیا گیا کیونکہ روح کی طرح ذہن کا بھی مشاہدہ نہیں کیا جا سکتا۔ پھر انسان کے ذہنی اعمال کا سائنسی طریقوں سے مطالعہ کیا جانے لگا اور اسے علم شعور قرار دیا گیا۔ بیسویں صدی میں شعور کے تصور کو بھی غیر سائنسی قرار دے دیا گیا کیونکہ اس کا بھی براہِ راست مطالعہ ممکن نہیں تھا۔ اب نفسیات کی تعریف قابل مشاہدہ کردار کے حوالے سے کی گئی یعنی کردار کا سائنسی مطالعہ۔ یہ تعریف امریکی ماہر نفسیات واٹسن نے کی تھی۔ لیکن یہ تعریف خاصی انتہا پسند تھی کیونکہ اس میں ذہن اور شعور جیسے بنیادی موضوعات کو نفسیات سے خارج کر دیا گیا تھا جس کی وجہ سے نفسیات کی وہ انفرادیت ختم کر دی گئی تھی جو اسے دوسرے معاشرتی سائنسز سے علیحدہ کرتی تھی۔ نیز ذہن اور شعور جیسے اہم موضوعات کا مطالعہ کئے بغیر کسی فرد کا مکمل تجزیہ کرنا بھی ممکن نہیں۔ اس لئے ماہرین نے ایسی تعریفوں کو تسلیم نہیں کیا۔ اب نفسیات کو انسانی اعمال و افعال کے سائنسی مطالعے کا نام دیا جاتا ہے۔

نفسیات ایک علم مطالعہ (Discipline) کا نام ہے جس کے اپنے اصول وضوابط اور طریقہ ہائے کار ہیں۔ دیگر معاشرتی سائنسز کی طرح نفسیات کی تعریف میں بھی ماہرین کے درمیان اختلاف موجود ہے۔ چند اختلافات کا ذِکر اوپر ہو چکا ہے۔ لفظ "Psyche" کا مطلب ذہن بھی ہوتا ہے اس لئے بہت سے ماہرین اسی نسبت سے نفسیات کم علم الذہن قرار دیتے ہیں۔ سب سے پہلے افلاطون (347-427 ق م) نے ذہن (Mind) کی اصطلاح استعمال کی تھی۔ بعد میں لاک، ولیم ہابز اور ٹچز وغیرہ نے نفسیات کو ذہنی اعمال (Mental Processes) کا نام دیا۔ ان کے نزدیک نفس صرف نفسی واراتوں کا مجموعہ ہے۔ اب پھر نفسیات کو علم روح بھی کہا جانے لگا ہے۔ اسے سائنسی معنوں میں سب سے پہلے کریٹس وول نے اٹھارویں صدی میں استعمال کیا تھا۔ امریکی ماہر نفسیات اور مفکر ولیم جیمس کے نزدیک ''نفسیات وہ علم ہے جو شعور اور شعوری اعمال کا مطالعہ کرے''۔ ایک اور امریکی مفکر جان ڈیوی لکھتا ہے ''نفسیات کو فرد کے ان ذہنی تجربات کی اقدار کا مطالعہ کرنا چاہئے جن کے مطابق فرد اپنے آپ کو ماحول کے تحت ڈھال لیتا ہے''۔ 'J.P.Watsan' نے نفسیات کو خالص سائنس کا درجہ دینے میں بڑا کردار ادا کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ''یا تو میں نفسیات کو ایک خالص معروضی سائنس بنا دوں گا یا اسے چھوڑ دوں گا۔ اس کے نزدیک:

"Psychology is the scientific study of experience and behaviour, human and animal, normal and abnormal, individual and social."

یعنی نفسیات سے مراد باقاعدہ اور سلسلہ وار تجربات اور کردار کا مطالعہ ہے۔ خواہ وہ انسانی ہو یا حیوانی، طبیعی ہو یا غیر طبیعی، انفرادی ہو یا اجتماعی اور کردار سے مراد نامیات کی ایسی سرگرمیاں لی جاتی ہیں جن کا مشاہدہ دوسرا شخص یا تجربہ کار کر سکتا ہو''۔ اس تعریف کو کرداری، معروضی، سائنٹفک اور تجرباتی کہا جاتا ہے۔ ولیم لیک ڈوگل نفسیات کو معروضی اور موضوعی (باطنی مشاہدہ) دونوں سمجھتا ہے۔

چند ماہرین نفسیات نے نفسیات کی اس طریقے سے تعریف کرنے کی کوشش کی ہے جو سائنسی ہو' نفسیات کی انفرادی حیثیت کو برقرار رکھے' اس کے وسیع اور پھیلے ہوئے موضوعات کو اپنے اندر سمو سکے اور مختلف اور متضاد نظریات رکھنے والے ماہرین نفسیات کو قابل قبول ہو۔ مثلاً روسی ماہر نفسیات روبن سٹائن کے مطابق ''نفسیات وہ سائنس ہے جو کہ انسان کے دماغ کی سرگرمیوں کے قوانین کا انکشاف کرے''۔ امریکی ماہرین نفسیات 'Kagan' اور 'Havemann' نے نفسیات کی یوں تعریف کی ہے۔ ''نفسیات وہ سائنس ہے جو قابل مشاہدہ کردار اور اس کردار کے عضویہ کے باطنی ذہنی عوامل اور ماحول کے بیرونی واقعات کے ساتھ تعلقات کا مطالعہ کرتی ہے اور اس کی تشریح بھی کرتی ہے۔ اس تعریف کو جامع سمجھا جاتا ہے کیونکہ یہ تعریف انسانی اور حیوانی کردار دونوں کے مطالعہ کو اپنے دائرہ کار میں لے آتی ہے۔ کردار کے علاوہ ذہنی عوامل کے مطالعہ کو نفسیات کا لازمی جزو سمجھتی ہے اور اس کے مطابق ذہنی عوامل کا بھی سائنسی مطالعہ ممکن ہے۔ ان کے علاوہ بھی نفسیات کی بہت تعریفیں کی گئی ہیں لیکن نفسیات کا مضمون اتنا وسیع ہے کہ اس کی تمام خصوصیات کو کسی ایک تعریف میں سمو دینا ناممکن ہے۔ آسانی کے لئے بس یہ سمجھ لیں کہ' ہر تعریف میں اس کا کوئی نہ کوئی پہلو شامل ہے۔

موجودہ دور میں ہمارے ہاں بھی معمولی پڑھے لکھے افراد میں نفسیات کا لفظ روزمرہ زبان کا حصہ بن چکا ہے۔ جس طرح والدین اور اساتذہ کو بچوں سے نفسیاتی طریقوں سے نبٹنا پڑتا ہے۔ یا پیر اپنے مریدوں کی نفسیات سے بخوبی واقف ہوتے ہیں یا ایک اچھا سیاستداں عوام کی نفسیات سمجھتا ہے۔ ماہر نفسیات بھی نفسیاتی الجھنوں اور بیماریوں کا علاج کرتا ہے۔ یہاں جو نفسیات کا تصور ابھرتا ہے' وہ علم غیب کا تصور ہے۔ اکثر لوگوں کی طرح یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ماہر نفسیات بھی کسی' پیر' نجومی یا دست شناس کی طرح لوگوں کے چہرے' ہاتھ یا ستارے دیکھ کر ان کی نفسیاتی یعنی ان کی شخصیت اور دل کا حال جان لیتا ہے۔ نفسیات کی زبان میں ایسے تصورات کو سٹیریوٹائپ (Stereotype) کہتے ہیں۔ اس سے مراد کسی فرد یا گروہ سے ایسے خیالات یا خصوصیات منسوب کرنا جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہ ہو۔ ایک ماہر نفسیات کا طریقہ کار ایک باقاعدہ منظم علم کے تحت ہوتا ہے۔ دراصل ماہر نفسیات کئی ایسے کام کرتا ہے جو ان پیشوں سے متعلقہ افراد کرتے ہیں۔ مثلاً کسی کی شخصیت کی خصوصیات معلوم کرنا' اس کی خامیوں اور خوبیوں کی نشاندہی کرنا' فرد کی پریشانیاں اور الجھنیں دور کرنا' فرد کو کاروبار' ازدواجی زندگی' جنسی معاملات اور مستقبل کے حالات وغیرہ کے بارے میں مشورے دینا وغیرہ وغیرہ۔ اس لئے ماہر نفسیات کو ان پیشوں سے منسلک کر دیا جاتا ہے۔ یہ پیشے صدیوں سال پرانے ہیں لیکن ان کی کوئی سائنسی حیثیت تسلیم نہیں کی جاتی کیونکہ یہ علوم سائنسی تحقیق کی بجائے ذاتی تصورات اور قیاسات پر مبنی ہوتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں نفسیات کا علم نیا ہے لیکن اب اسے ایک سائنس کی حیثیت حاصل ہو رہی ہے۔ ماہرین نفسیات معلومات اکٹھی کرنے کے لئے وہی طریقے استعمال کرتے ہیں جو سائنسدان کرتے ہیں۔ یعنی مفروضے قائم کرنا' ان کی جانچ پڑتال کے لئے مشاہدہ کرنا' تجربات کرنا' مفروضات کو تجربات اور مشاہدات کی روشنی میں پرکھنا وغیرہ۔ یہ خیال بھی درست نہیں کہ نفسیات کے پڑھنے سے ذاتی مسائل حل ہو جاتے ہیں۔

ڈاکٹر برہان احمد کہتے ہیں کہ دیگر علوم کی طرح سائیکالوجی کی سائنس بھی پہلے فلسفے کا جز تھی لیکن علوم کی نشوونما کی وجہ سے یہ علوم فلسفے سے الگ کر دیئے گئے۔ انہوں نے ہر علم (Science) کے لئے چند شرائط ضروری قرار دیئے ہیں۔ ان میں ایک یہ بھی شرط ہے کہ ''ہر سائنس کے لئے تین وظیفے ادا کرنے ضروری ہیں یعنی مشاہدہ (Observation) گروہ بندی (Classification) اور توجیہ (Explantion) توجیہ کے لئے ہر سائنس کے کچھ اپنے مقولات (Categories) یعنی بنیادی تصورات ہونے چاہئیں''۔ انہوں نے طبعیات' حیاتیات اور نفسیات کے مقولات کی تفصیل بھی دی ہے۔ مثلاً نفسیات کے مقولات یہ ہیں۔ انا یا خودی (Ego) شعور (Consciousness)' ادراک (Knowing)' جذبہ' ارادہ (Willing)' مقصود (Purpose)' ذریعہ (Means) وغیرہ وغیرہ۔ ماہر نفسیات رفیق جعفر کے نزدیک مختلف سائنسی علوم کے مقاصد اس لحاظ سے مشترک ہیں کہ وہ سب کسی عمل کو سمجھنے یا اس کی وجوہات تلاش کرنے' پیمائش کرنے' نوعیت بیان کرنے' پیش گوئی کرنے اور اسے کنٹرول کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ نفسیات کے بھی یہی مقاصد ہیں یعنی کردار اور ذہنی کیفیات کو' پیمائش کرنا' ان کی نوعیت بیان کرنا' کردار اور ذہنی کیفیات کو سمجھنا اور ان کی وجوہات تلاش کرنا' کردار اور ذہنی کیفیات کی پیش گوئی کرنا اور انہیں کنٹرول کرنا وغیرہ۔

ایک ماہر نفسیات کے الفاظ میں ''نفسیات ایک نئی سائنس ہے جو قدیم سوالوں کے جوابات تلاش کرتی ہے''۔ یعنی انسان اپنی ذات' لوگوں کے کردار' فرد کے محرکات اور اس قسم کے دیگر مسائل سے دوچار رہا ہے۔ اس لحاظ سے نفسیات ایک قدیم علم ہے۔ جو ارتقائی مراحل طے کر رہا ہے۔ آج سے ہزاروں سال پہلے بے شمار تکالیف اور مشکلات کے باوجود بھی انسان نے اپنی ذات اور دوسرے لوگوں کے کردار کے بارے میں کچھ نفسیاتی نظریات قائم کئے جنہیں نفسیات کی ابتدائی شکل قرار دیا جا سکتا ہے۔ ان میں سب سے اہم تصور 'روح' کا ہے۔ قدیم انسان کے خیال میں ہر فرد کے اندر کوئی مادی چیز یا کوئی اور فرد موجود تھا جو مرگی یا بیماری میں اس کے اندر گھس جاتا تھا اور خواب یا موت میں اس کے جسم سے نکل جاتا تھا۔ اس طرح قدیم انسان نے انسانی خون' سانس اور سائے کو روح سمجھا جس کے نکل جانے سے انسانی زندگی ختم ہو جاتی ہے۔ ظاہر ہے یہ تصور روح کے مذہبی تصور سے خاصا مختلف ہے۔ ایک اور عام خیال تھا کہ پاگل پن کے دورے میں جنات' شیطان یا کوئی اور روح جسم میں داخل ہو کر فرد کو کنٹرول کرتی ہیں۔ اور اِن غیبی قوتوں کو نکالنے کے لئے مختلف حربے استعمال کئے جاتے تھے۔ یہ کام جادوگر' عامل وغیرہ سرانجام دیتے تھے۔ اِن تصورات کی جڑیں انسانی لاشعور میں اتنی گہری ہیں کہ انبیاءؑ نے ان توہم پرستیوں کو انسانی ذہن سے کئی بار نکالا بھی لیکن یہ تصور ابھی تک اکثر لوگوں کے ذہن میں موجود ہے۔ قرآن پاک کی نیر درخشندہ' ضیا تابندہ اور سیرت محمدیہؐ کے جگمگاتے چراغ (سراجاً منیراً) نے دنیا میں عقل و دانش و علم و بصیرت کی روشنی پھیلائی تو دنیا کی کچھ قوموں نے غلط تصورات' معتقدات اور توہمات کے دبیز پردوں کو چاک کر دیا۔ مگر ہم ابھی تک اُسی قدیمی دور میں رہ رہے ہیں۔

(جاری ہے)

یوسف سیجا، کراچی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

دعا کے مضمون کو پرویز صاحب نے کس طرح سے پیش کیا ہے؟

پرویز صاحب کی تحریروں سے متاثر افراد سے دعا سے متعلق اگر آپ پوچھیں گے تو وہ سب سے پہلا کام یہ کریں گے کہ آپ کو کسی کتاب کا نام بتا دیں گے۔ اور آپ اگر یہ کہیں گے کہ آپ کیا سمجھے ہیں تو اس کا جواب ہوگا کہ جو لوگ دعا کا مروجہ تصور رکھتے ہیں درحقیقت وہ خدا کے قرآنی تصور سے ناواقف ہیں وہ مذہبی لوگ ہیں۔ اور اسلام دین ہے مذہب نہیں ہے۔ ان دو جملوں کے علاوہ وہ کچھ نہیں جانتے۔ پرویز صاحب کی تحریروں کی بنیاد پر سمجھا ہوا یہ مضمون ہے۔ پرویز صاحب علامہ اقبال کے فلسفہ دعا سے متاثر تھے اور انہوں نے ان کے اشعار سے مدد لیتے ہوئے اپنی بات مکمل کی ہے۔ انسان کا کوئی مقصد ہوتا ہے۔ مقصد کے لئے ایک منزل کا تعین ضروری ہے۔ انہی منزلوں کو طے کر کے آپ اپنے مقصد تک پہنچ سکتے ہیں۔ مقصد کے لئے منزل ضروری ہے اور منزل کے لئے راستے کا تعین ضروری ہے۔ جب راستے کا انتخاب آپ کر لیتے ہیں تو اس کے بعد مرحلہ آتا ہے آپ کے قدم اٹھانے کا۔ جب تک آپ ارادہ نہیں کریں گے اس وقت تک آپ قدم نہیں اٹھا سکتے۔ قدم اٹھانے کے لئے ضروری ہے کہ آپ کے پاس ایک آرزو ہو۔ اور آرزو میں اتنی شدت اور گرمی اور توانائی ہو کہ یہ غیر ممکن ہو جائے کہ آپ قدم نہ اٹھا سکیں۔ اور یہ آرزو دعا کا نتیجہ ہوتی ہے۔ جسکے لئے اقبال فرماتے ہیں لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری۔۔۔۔۔۔۔ لہٰذا دعا کرنا اللہ کے قرآنی تصور کے خلاف نہیں ہے۔ خود پرویز صاحب نے مفہوم القران میں لکھا ہے۔

فَنَادَتۡهُ الۡمَلٰٓئِكَةُ وَهُوَ قَآئِمٌ يُّصَلِّىۡ فِى الۡمِحۡرَابِ ۙ (3:39)

وہ ابھی قربانگاہ میں کھڑا محوِ دعا تھا کہ ملائکہ نے اُسے آواز دی اور کہا کہ

هُوَ الَّذِىۡ يُصَلِّىۡ عَلَيۡكُمۡ وَمَلٰٓئِكَتُهٗ (33:43)

اگر تم ایسا کرتے رہے تو قوانین خداوندی کی برکات اور اس کی کائناتی قوتوں کی تائید و نصرت تمہارے ساتھ رہے گی ان کی طرف سے تم پر تبریک و تہنیت کے پھول برسیں گے هُوَ الَّذِىۡ يُصَلِّىۡ عَلَيۡكُمۡ (33:43) ان کی طرف سے تم پر

تبریک وتہنیّت کے پھول برسیں گے۔

یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ (33:56)

مفہوم القرآن: جب خدا اور اس کے ملائکہ کی تائید ونصرت تمہارے رسول کے ساتھ شامل ہے تو ایسا نہیں ہے کہ تمہیں کچھ کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے تمہارے لئے ضروری ہے کہ تم اپنے عمل پیہم سے رسول کے مشن کی تقویت کا موجب اور اس کے دست وبازو بنو۔ اُس کے پروگرام کو تکمیل تک پہنچاؤ۔

وَصَلَوٰتِ الرَّسُوْلِ (9:99)

اور رسول کی طرف سے تحسین وآفریں کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔

وَصَلِّ عَلَیْہِمْ ؕ اِنَّ صَلٰوتَکَ سَکَنٌ لَّہُمْ (9:103)

اور ان کے اچھے کاموں کی تحسین وستائش سے ان کی حوصلہ افزائی کرو۔ اس سے انہیں اطمینان خاطر اور سکونِ قلب حاصل ہوگا۔

مَا یُنْفِقُ قُرُبٰتٍ عِنْدَ اللّٰہِ وَصَلَوٰتِ الرَّسُوْلِ (9:99)

مفہوم القرآن: جو کچھ خرچ کرتے ہیں اسے خدا کے ہاں بلند درجات اور رسول کی طرف سے تحسین وآفریں کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔

وَصَلِّ عَلَیْہِمْ ؕ اِنَّ صَلٰوتَکَ سَکَنٌ لَّہُمْ (9:103)

مفہوم القرآن: اور ان کے اچھے کاموں کی تحسین وستائش سے ان کی حوصلہ افزائی کرو۔ اس سے انہیں اطمینان خاطر اور سکونِ قلب حاصل ہوجائیگا۔ مفہوم القرآن: محو دعا ہونا، قوانین خداوندی کی برکات اور اس کی کائنات کی قوتوں کی تائید و نصرت کا ہونا، تبریک وتہنیت کے پھول برسنا، کسی شئے کا سکون قلب اور تسکین کا باعث ہونا۔ یہ سب انسان کی آرزو کے پرت ہیں۔ انسان کی ضروریات ہیں انسان کی کیفیات ہیں۔ پرویز صاحب نے بسم اللہ الرحمن الرحیم کا مفہوم لکھتے ہوئے لکھا ہے۔ کہ اللہ کی ذمہ داریاں انسان کے ہاتھوں پوری ہوتی ہیں۔ اور اس کے لئے ضروری ہے کہ انسان اللہ کا رفیق بن جائے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ میرا رفیق اعلیٰ ہے۔ جب ہم کسی کو دعا دیتے ہیں کہ اللہ تمہارے کاروبار میں برکت عطا فرمائے تمہاری مشکلوں کو آسان کرے تمہیں کشادہ رزق عطا فرمائے۔ تو اس سے دو افراد کے درمیان میں محبت اور انسیت پیدا ہوتی ہے اتحاد پیدا ہوتا ہے لوگ ایک دوسرے سے قریب آتے ہیں۔ جس کو دعا دے رہے ہوتے ہیں اس کے اندر آرزو کا احیاء ممکن ہوجاتا ہے۔ خود اللہ تعالیٰ اپنے نبی سے فرمارہے ہیں اوپر آیات آپ کے سامنے ہیں۔ اس کا مطلب یہ تو نہیں ہوتا کہ دوسرا شخص صبح دکان نہیں کھولے گا اور گھر پر بیٹھ جائے گا۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اللہ کے عالمِ خلق کے قوانین کی فہم کے لیے انسان کو عقلی صلاحیت کی ودیعت

اِنسانی ذات کو اللہ کی طرف سے درجِ ذیل دو مُضمر صِفات سے متصِف کیا گیا ہے تا کہ وہ اُن کے استعمال سے اپنی موجود ذات کی نشوونماء کی تکمیل کر کے آخرت میں مزید ارتقاء کا اُمیدوار بن سکے۔

1۔ اِنسانی اعمال میں آزادیِ اِرادہ سے انتخاب کرنے کی صلاحیت۔

2۔ کائنات اور اپنی ذات کی حقیقت کے عِلم سے باخبر اور قابو پانے کے لیے عقل کی صلاحیت سے تسخیرِ فطرت کی تکمیل کا فریضہ سونپا گیا ہے۔

اِنسانی ذات کی پہلی صِفت اِنسانی اعمال میں آزادیِ اِرادہ سے انتخاب کرنے کی صلاحیت کا جائزہ پچھلے باب میں لیا گیا ہے۔ یہاں ہم اِنسانی ذات کی عقل سے فِطرت اور اپنی ذات پر قابو پانے کی استعداد کے عِلم کی صِفت کو زیرِ بحث لا رہے ہیں۔ حسبِ دستور یہاں بھی آغاز عِلم کے لغوی اور اصطلاحی مفہوم کی جانچ سے کیا جا رہا ہے۔

عِلم کا لغوی و اصطلاحی مفہوم

علم کے معانی کسی چیز کو کما حقہ جاننا، پہچاننا، حقیقت کا ادراک کرنا۔ یقین حاصل کرنا محسوس کرنا، محکم طور پر معلوم کرنا ہے۔ اِس کی تعریف یہ کہہ کر بھی بیان کی جاتی ہے کہ یہ ایک ایسا نشان ہوتا ہے کہ جس سے کسی شے کی حقیقت کا اِدراک ہو کر پہچانی جا سکے اور دیگر اشیاء سے متمیّز ہو سکے۔ یہ تمیز تو کسی چیز کی ذات کی اصل حقیقت کا ادراک کرنے سے ہوتی ہے یا ایک چیز پر کسی صفت کے ساتھ حکم لگانے سے ہوتی ہے جو فی الواقع مُثبت یا منفی ثابت ہو۔ لہٰذا علم کے یہ دو معانی کئے جاتے ہیں۔

ایک تو یہ ہے کہ فلاں شے کی حقیقت کیا ہے؟

اور دوسری بات یہ ہے کہ یہ حقیقت کس قانون کے تابع کام کر رہی ہے؟

عِلم کی ایک حیثیت سے فطری ہوتی ہے جو حواس سے حاصل ہونے کے ساتھ ہی مکمل ہو جاتی ہے، جیسے وہ عِلم جس کا تعلق موجودات عالم سے ہے۔

دوسری عقلِ عملی سے وہ جو عمل کے تجربی نتائج کا مشاہدہ کئے بغیر تکمیل نہ پائے۔

مغربی مفکر ہیوم کے نزدیک علمیت کا مفہوم راست حسی، ادراکی شعور ہے جو ارتسامات سے حاصل ہو۔ ان ارتسامات کی مدہم، سادہ اور مرکب نقول تصورات اور انکے مابین اضافات بھی علمیت کے مفہوم میں شامل ہوتے ہیں۔

اخلاقیات کے مستند مفکر کانٹ کا علم کی تعریف میں یہ موقف ہے کہ علم کا مواد تجربی اور اس کی شرائط قبل تجربی ہونے کی وجہ سے کُلی ہوتی ہیں۔

درحقیقت عقل کو شعور ہی کی ایک حتمی صلاحیت کے طور پر متعارف کرایا جاتا ہے، لہٰذا عقل کی وضاحت، شعور کے تجزیہ سے بھی کی جاتی ہے۔ شعور ایک ڈیٹا بنک ہے جہاں لمحہ بہ لمحہ آنکھ، کان، ناک، زبان اور ہاتھ یعنی حواسِ خمسہ کے ذریعہ سے معلومات جمع ہوتی رہتی ہیں. بچپن سے لیکر مرنے تک ہمارے اردگرد جو کچھ بھی ہوتا ہے وہ ہمارے حصولِ علم کے لیے حواس خمسہ کے ذریعہ سے ہمارے شعور میں جاتا ہے۔ عقل بھی شعوری صلاحیت سے عبارت ہے۔ شعور میں موجود اطلاعات و معلومات کو بروئے کار لانا اور اسی کو بنیاد بنا کر معقول نتیجہ حاصل کرنا عقل کا خاصہ ہے۔ اگر عقل میں شعور کی صلاحیت یعنی اطلاعات و معلومات ہی نہ ہوں تو وہ بذاتِ خود نتیجہ حاصل کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ ہمیں یہاں یہ ذہن میں رکھنا چاہیئے کہ انسان کی حیوانی زندگی تک کے ارتقاء کے مقام تک عقل پر شعوری طور پر جبلی تقاضوں کا غلبہ ہوتا ہے، جو اُس کے جبلی تقاضا کے فریضہ تحفظِ خویش کے لیے اُٹھائے گئے ہر جائز اور ناجائز قدم کے حق کا جواز تراشنے کے دائرہ کے گرد ہی گھومتا رہتے ہیں۔

پس واضح ہوا کہ عقل کا صحیح استعمال اس وقت مفید ہوگا جب شعور میں اس چیز کے متعلق ہر قسم کی اطلاعات و معلومات اکٹھی کر کے دستیاب کر دی گئی ہوں۔

قرآن میں اِس کے لیے قلب کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔ لغت میں قلب کے بنیادی معانی دِل بیان کئے جاتے ہیں جو الٹ پلٹ ہوتا رہتا ہے۔ انقلاب بھی اسی سے ہے اور انقلاب میں سب کچھ الٹ پلٹ ہو جاتا ہے۔ قلب شعور کی وہ صلاحیت ہے جو چیزوں کو اُلٹ پلٹ کر منطقی طور پر جانچتی ہے۔ قرآن میں ہے کہ:

لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا (7:179)

ان لوگوں کے پاس دِل ہیں لیکن وہ اس سے سمجھ نہیں پاتے۔

قلب اور فواد دونوں دِل کے معانی میں استعمال ہوتے ہیں، جس سے وہ تفقہ کرتے ہیں۔

فواد کے جذبات اور قلب کے منطقی طور پر سمجھنے کے لیے علمِ کا جدید تاریخ میں استدلالی و غیر استدلالی اقسام میں مطالعہ کیا جاتا ہے۔ آج کے منطقی دور سے قبل زیادہ تر علمِ غیر استدالی پر انحصار کیا جاتا تھا۔ غیر استدلالی کے علم کے داعی تو دلائل کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتے اور اِن کی اپنے مؤقف پر ڈٹے رہنے کی وجہ سے دلائل کی طرف توجہ ہی نہیں دیتے ہیں۔

اخلاقیات میں علمِ غیر استدلالی کے معنی یہ ہیں کہ ہمارے اندر کوئی طاقت ودیعت کی ہوئی ہے، جو بلا دلیل حق و باطل

ہونے کی طرف رہنمائی اور فیصلہ صادر کرتی رہتی ہے۔

اِس کے برعکس علم استدلالی کے حامی علم غیر استدلالی کی اندرونی قوت کی سند سے انکاری ہیں اور اِسے مُطلق الحق کی تلاش میں علم کا درجہ دینے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ عصرِ حاضر میں بلا دلیل مؤقف کو سند کا درجہ نہ دیتے ہوئے اِس کو بطورِ ذریعہ علم اہمیت نہیں دی جاتی ہے۔ قرآن میں بھی کسی مؤقف کی صداقت کے لیے سند اور دلائل کا تقاضہ کرنے کی تائید پائی جاتی ہے کہ:

قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (2:111)

کہو کہ اگر تمہارا مؤقف صداقت پر مبنی ہے تو اِس کے دلائل سے سند لاؤ۔

علم کی تاریخ میں البتہ علم غیر استدلالی کو داخلی تجربیت کا ذریعہ علم قرار دیتے ہوئے، اُسے درج ذیل علوم میں زیرِ بحث لایا جاتا ہے۔

1۔ ضمیر

2۔ باطنیت یا تصوف

3۔ وجدان یا نفس غیر شعوری

یہاں ہم اِن سبھی کا قدرے تفصیل سے جائزہ لے رہے ہیں۔

ضمیر بطورِ ذریعہ علم کا نظریہ

فلسفہ میں ضمیر بطورِ علم غیر استدلالی سے مراد حق و باطل کے درمیان امتیاز کرنے کا ذریعہ مراد ہوتا ہے۔ اس کی شدید تاثری کیفیت کے رجحان کو سماجی طور پر بُرے عواقب برداشت کرنے کے نتائج سے مشروط کر کے واضح کیا جاتا ہے۔ نظریہِ ضمیر کے قابلِ قبول ہونے کے لیے اِس کے حامی اس کی درجِ ذیل خصوصیات کے حامل ہونے کو کافی سمجھتے ہیں۔

1۔ ضمیر ایک وجدانی اور جبلی صفت ہے اور اس کے الحق ہونے کے فیصلے بیرونی اثرات سے مبراء ہوتے ہیں۔

2۔ ضمیر ایک عالمگیر حقیقت کے طور پر ہر انسان میں موجود ہوتی ہے۔ انسانوں میں بظاہر مختلف اخلاقی نظام رائج ہیں، جو وقت اور زمانہ کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں لیکن ضمیر ایک ایسی شے ہے، جو ہمیشہ موجود رہتی ہے۔ یہ فِطری علم ہے اور اس کا تعلیم و تربیت سے بھی بدلنے کا کوئی امکان نہیں ہوتا۔

3۔ ضمیر کی ملامت یا سرزنش ایک عالمگیر اصول ہے۔ بڑے سے بڑا ظالم اور بدکار بھی اسکی ملامت سے بچ نہیں سکتا۔ ایک وقت آتا ہے کہ جب اس کے ضمیر کو اپنی غلطی اور توبہ کرنے کا احساس ہوتا ہے

4۔ ضمیر ایک محتسب کا کام کرتا ہے۔ وہ ہماری غیر آسودہ بُری خواہشات کو شعور میں آنے سے روکتا ہے۔

5۔ اِس میں شک نہیں کہ ہماری شعوری زندگی میں بُری خواہشات کی گنجائش اور گرفت موجود ہوتی ہے، لیکن ہم اپنے

مفادت کے تحت شعوری طور پر اسے نظر انداز کر کے لاشعور میں دبا دینے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ اِس ضِمن میں ہمیں معلوم ہونا چاہیئے کہ اِس طرح ہماری تمام اخلاقی بیماریاں ضمیر کی آواز دبا دینے سے اگرچہ شعور میں تو ختم ہو جاتی ہیں، لیکن لاشعور میں موجود رہنے کی وجہ سے ختم نہیں کی جا سکی ہیں۔

اس لیے ضمیر کے داعی گروہ کا عقیدہ ہے کہ جب تمہارے سامنے کوئی بات آئے تو اپنے دل سے پوچھو کہ ایسا کرنا اچھا ہے یا برا۔ جو دل کا فیصلہ ہوگا۔ اس کے مطابق یہ خیر یا شر کہلائے گا۔ اگر ضمیر نے اسے قبول کر لیا، تو وہ اچھا ہوگا اور اگر قبول نہ کیا تو وہ بُرا ہوگا۔

اس نظریہ پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ ضمیر، وراثت اور ماحول وغیرہ کے خارجی اثرات سے اس درجہ متاثر ہوتی ہے کہ یہ حق و باطل کی فطری تمیز کا ذریعہ قرار نہیں پا سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا میں ضمیر کی آواز کبھی ایک نتیجہ پر نہیں پہنچتی۔ لہٰذا ہمارے لیے ضروری ہوا ہے کہ نظریہ ضمیر کے عِلم کے ہونے کا تنقیدی جائزہ لیا جائے۔

نظریہ ضمیر کا بطورِ عِلم تنقیدی جائزہ

نظریہ ضمیر کی داخلی فطری ذریعہ عِلم کی حیثیت کو ہی یہ کہہ کر چیلنج کیا جاتا ہے کہ یہ بذاتِ خود کوئی داخلی آواز نہیں ہے۔ یہ سوسائٹی میں رائج الوقت اندرونی طور طریقوں کے رواجوں پر مشتمل ہوتی ہے اور اُسے عالمگیر نوعیت کا داخلی عِلم قرار دینا درست نہیں ہے۔ کیونکہ یہ رواج بھی اچھے اور بُرے کی تمیز کرنے کے عِلم کی اہلیت نہیں رکھتے۔

سقراط کے اندرونی آواز کو ضمیر کا درجہ دیا بھی جائے، تو اِس سے ہمیں اُس کی اپنی مِثال سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ اِنسان کے اندر کوئی ایسی قوت ہے جو اسے شر سے روکتی ہے۔ لیکن یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ قوت اس امر کا فیصلہ بھی کر سکتی ہے کہ فلاں کام فی ذاتہٖ شر ہے۔ اس لیے اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔ اگر اس میں یہ عِلمی صلاحیت موجود ہو تو پھر ''اخلاقیات'' کے متعلق کچھ سوچنے اور لکھنے کی ضرورت باقی نہیں کیونکہ پھر تو مسئلہ یوں ہو جائے کہ:

1۔ ضمیر وہ کسوٹی ہے جو حق و باطل کو الگ الگ کر دیتی ہے۔

2۔ ہر انسان کے اندر ضمیر موجود ہوتا ہے اس لیے

3۔ ہر انسان از خود حق و باطل کا امتیاز کر سکتا ہے۔

4۔ خیر، اپنی ذات میں خیر اور شر اپنی ذات میں شر ہوتی ہے۔ اس لیے خیر اور شر کی عالمگیر فہرستیں موجود ہونا چاہئیں۔

خیر و شر کی ان فہرستوں کا عِلم اور حقیقت سے بھی کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ مختلف اشخاص کا ضمیر خیر اور شر کے متعلق الگ الگ فیصلے دیتا ہے۔ اگر ضمیر کی آواز ساری دنیا کے انسانوں کے لیے ایک ہی ہوتی تو صحیح اور غلط، خیر و شر، حق و باطل کے حوالہ سے جھگڑے ہی کیوں پیدا ہوتے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ضمیر کی آواز حق و باطل کا مطلق معیار نہیں بن سکتی۔ ضمیر تو معاشرے کا آئینہ دار ہے اور اسی کے خیال کی نمائندگی کرتا ہے۔ لہٰذا یہ ناممکن ہے کہ اس کے احکام تعصب سے

خالی ہوں۔خنزیر کا گوشت کھانے کا تصور ہی مسمانوں کو قے کروانا شروع کر دیتا ہے اور غیر مسلم اس کو مزا لے لے کے کھاتے ہیں۔ یہاں مسلمان اور غیر ہندو گائے کا گوشت مزے سے کھاتا ہے، جبکہ ہندو کے ہاں اس کا ضمیر گائے کو خدا کا درجہ دیتا ہے۔سوسائٹی نے جو کچھ داخلی طور پر طے کر رکھا ہے ہمارا ضمیر اِسی کے عِلم کا مظاہرہ کرتا ہے۔حق اور باطل یا صِدق و کذب جاننے کا معیار میں اندر کا عِلم نہیں بلکہ معاشرہ میں رائج رسومات کا نتیجہ کا دخل ہوتا ہے۔اگر ضمیر کی آواز کو مُطلق اقدارِ حق کے لیے سند مان لیا جائے تو یہ صرف ایسے شخص کے لیے سند بن سکتی ہے۔جس کی ضمیر اسے ایسا کرنے یا سمجھنے کا کہتی ہے۔میرے ضمیر کا فیصلہ آپ کے لیے سند قرار نہیں دیا جاسکتا۔لہٰذا یہ ''اخلاقیات'' میں حق و باطل کا معیار مطلق کا علم دینے کی اہلیت نہیں رکھتی۔

یہ کوئی پیدائشی قوت نہیں ہے بلکہ اکتسابی شے ہے جس میں تعلیم و تربیت سے تبدیلی لا کر بہتری پیدا کی جاسکتی ہے۔ضمیر کی آواز انسان کے ابتدائی ماحول، تعلیم، تربیت، معاشرہ کی فضا سے مرتب ہوتی ہے یہ درحقیقت معاشرہ کا داخلی نظام ہوتی ہے، جس طرح تقلید معاشرہ کا آئینہ دار ہوتی ہے۔یہ اپنے اپنے ماحول اور مذہبی عقائد کا پرتو ہوتی ہے اور ایسی قوت نہیں ہوتی کہ وہ ذریعہ علم بن سکے۔اگر ''اخلاقیات'' میں مطلق اور مستقل حق کی اقدار کے علم کے لیے ضمیر سند قرار پا جائے تو انسانی کاروبار ایک دن کے لیے بھی نہیں چل سکتا۔لہٰذا ضمیر الحق تک رسائی کی اہلیت نہ رکھنے کی بِنا پر عِلم کے دائرہ کار کی حدود میں جگہ نہیں پا سکتی۔

اب ہم عِلمِ غیر استدلالی کے دوسرے داخلی نظریہ باطنیت/تصوف کے موقف کا جائزہ لیتے ہیں۔

باطنیت، کشف یا تصوف بطور ذریعہِ علم کا موقف

عِلمِ غیر استدلائی میں باطنیت/کشف یا تصوف کے ذریعہِ داخلی عِلم کو بھی شامل کیا جاتا ہے۔اِس غیر استدلالی علم کے منبع کا دارومدار کشف کے تصور کو سامنے لا کر کیا جاتا ہے۔لہٰذا ضروری ہے کہ اس کے مفہوم سے آگاہی حاصل کی جائے۔عربی کی معتبر لُغت تاج العروس میں کَشْفُ کا مفہوم کُھلنا یا پردہ اٹھا دینا اور کسی بات کو ظاہر کر دینے کا بیان کیا جاتا ہے۔قرآن کریم میں بھی کشف اِنہی معانی کے لیے موجود ہے کہ:

فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ (50:22)

ہم نے (تیری آنکھوں سے) پردہ اٹھا دیا اور اس طرح حقائق تجھ پر منکشف ہو گئے۔

فلسفہ میں اسپنوزا کشف کو اصطلاح کے طور پر عقل سے اِکتساب ہونے کے ذریعہ کے برخلاف حقیقتِ اشیاءؑ کا قطعاً اور مطلقاً راست علم بالیقین کے طور پر بیان کرتا ہے۔ باطنیت میں بھی یہ لفظ باطنی طور پر راست احساس کے مفہوم کے لیے استعمال ہوتا ہے۔فلسفہ میں تصوف کا نظریہ بھی معرفتِ الٰہی کا بطریق کشف وصول کرنے کا تصور مراد ہوتا ہے۔ یہاں وصول کرنے سے ہی وضاحت ہو جاتی ہے کہ علم حاصل نہیں، بلکہ کسی سے وصول کیا جا رہا ہے۔لہٰذا صوفی کو صاحبِ وصول کا درجہ دیا جاتا ہے، جو مجاہدہ کر کے راستہ طے کرتا ہوا منزل تک رسائی کی کوشش میں مصروف رہتا ہے۔اِنہیں عِلم کی بجائے مہارت کا نام اور وہ بھی فنِ اکتسابی کا نام دینا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے، جو اِنسان میں قوت ارادی کو پختہ اور مستحکم کرنے کا ذریعہ بنتا

ہے۔ یہ سبھی مترادف معانی کشف کی اصطلاح کے ہی ذیل میں آتے ہیں۔ یہ جو ہمارے ہاں کشف والہام کا عقیدہ ہے، اس کے راست علم ہونے کی سند قرآن کریم سے نہیں ملتی۔ ختم نبوت کے بعد یہ عقیدہ رکھنا کہ کوئی شخص عقلی ذریعہ استعمال کئے بغیر براہ راست حقائق کا علم حاصل کرسکتا ہے، عقیدۂ ختمِ نبوت کی مہر کو توڑ دینا ہے۔ اِس لیے کہ ایسے علم کا نزول صِرف اور صِرف کلامِ الٰہی میں الوحی سے انبیاء کے ذریعہ ہی ہوتا ہے، جو ختم نبوت کے بعد باقی نہیں رہا۔ اب انسانوں کے لیے علم کے سرچشمے صرف دو ہیں۔

1۔ قرآن کریم (جو وحی پر مشتمل ہے) اور

2۔ عقل انسانی۔

کشف وتصوف کو ہم زیادہ سے زیادہ ایک مذہبی عقیدہ کا درجہ دے سکتے ہیں۔ اِن پر علم وعقل اور تدبر وفکر کے دروازے بند کر کے داخل ہونے کے لیے غیر مشروط عقیدت واحترام پر ہی انحصار کیا جاتا ہے۔ وہ دنیاوی علوم وفنون میں ترقی کرنے کی بجائے ترک دنیا کی بنیاد پر فنافی اللہ کے عقیدہ کی تعلیم دیتا ہے۔ توکل، قنوطیت اور تقدیر پرستی اس کے لازمی ثمر ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جب تصوف شعروادب میں داخل ہوتا ہے، تو عوام پر اس کی اثر اندازی بڑھ جاتی ہے۔ اِس کے نتیجہ میں عوام کے ذوق اور فکری تنزل کا باعث بن جاتا ہے۔ اس بے راہروی کے تدارک کے لیے علامہ اقبال نے فلسفہ اور تصوف کا گہرا مطالعہ کیا۔ اُنہوں نے تصوف کے انسان کامل اور فلسفہ کے فوق البشر کے تصورات سے فلسفہ خودی کا بنیادی تخیل قائم کر کے ایک نئی صورت میں پیش کیا۔ علامہ اقبال کا نظریہ یہ ہے کہ خدا کے مقابلہ میں انسان بھی مستقل ہستی کا مالک ہے اور وصل کی آرزو کے بجائے وہ اپنی خودی کو رفعت دینے کا مقصد رکھتا ہے۔

صوفیہ کہتے ہیں کہ ہم اپنے نفس کو نفس کل میں جذب کر دیں لیکن اقبال کا کہنا ہے کہ جب اِنسان کی انفرادیت ہی ضائع ہوجائے گی تو وصال کا لطف کیا۔ اگر قطرہ دریا میں ملے گا تو اپنی جداگانہ حیثیت کھودے گا۔ لہٰذا ہمیں نفی خودی کے بجائے تحفظ خودی کی تدبیر کرنا چاہیے۔ دراصل نظریہ خودی تصوف خودی کے اس مخصوص تصور کا ردعمل ہے جو انسان کو اپنی جداگانہ حیثیت کو مٹانے کی تلقین کرتا ہے۔ اِس کی وضاحت علامہ اقبال نے اپنے پانچویں خطبہ کے آغاز ہی میں کردی تھی۔ اس انفرادی تجربہ کی تصریح مشہور صوفی بزرگ حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے الفاظ میں یوں کی ہے۔

محمدؐ عربی برفلک الافلاک رفت و باز آمد
واللہ اگر من رفتمے ہرگز بازنیامدے

محمدؐ، فلک الافلاک کی بلندیوں پر پہنچ کر واپس تشریف لے آئے۔ خدا شاہد ہے کہ میں اگر اس مقام تک پہنچ جاتا تو کبھی واپس نہ لوٹتا۔

علامہ اقبال نے اپنے خطبات کے پہلے ہی خطبہ میں واضح کیا ہے کہ صوفیانہ مشاہدات کو دوسروں تک پہنچانا (یعنی ان کا

ابلاغ) ناممکن ہے تو اس لیے بھی کہ یہ مشاہدات وہ غیر واضح احساسات ہیں جن میں عقلی استدلال کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ حاصل کلام یہ ہے کہ تصوف میں ارباب کشف کے نتائج ایک دوسرے سے یکسر مختلف اور بعض اوقات متضاد ہوتے ہیں۔ اس لیے ضمیر کی طرح یہ علم بھی حقیقت کے ادراک سے قاصر ہے۔

مزید برآں تصوف میں صاحب تجربہ کا نتیجہ یکسر انفرادی ہوتا ہے جس کی وجہ سے وہ اپنے اندر عام دنیائے انسانیت کے لیے کوئی پیغام نہیں رکھتا۔ ہمارے پاس کوئی ایسا ذریعہ نہیں ہے جس سے اس قسم کے احوال و مشاہدات کی تحقیق علمی نہج پر کی جائے۔ نظریہ باطنیت یا تصوف کی توضیح ہمارے موضوع سے صرف ذریعہ علم کی تحقیق تک محدود ہے، اس لیے مزید تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ اسی تناظر میں اب ہم یہاں علمِ غیر استدلالی کے تیسرے اور آخری نظریہ وجدان کا بھی جائزہ لے رہے ہیں۔

وجدان بطور ذریعہ علم کا نظریہ

وجدان کی تعریف کے بارے میں انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا میں یہ وضاحت ملتی ہے کہ:

وجدان وہ ذریعہ علم ہے جس کے ذریعہ سے ہم کسی استنباط، مشاہدہ، عقل یا تجربے کے بغیر کوئی علم حاصل کرتے ہیں۔ چنانچہ یہ بالکل آزاد اور بنیادی ذریعہ علم ہے جو ہمیں کسی ذریعے سے نہیں بلکہ براہِ راست حاصل ہوسکتا ہے۔ ضروری سچائیاں اور اخلاقی اصول بعض اوقات وجدانیت کے ذریعہ سے بغیر استدلال بیان کیے جاتے ہیں۔

مزید یہ تعریف بھی کی جاتی ہے کہ وجدان بلا واسطہ حواس غیر استدلالی زمان و مکان کے لحاظ سے غائب آئندہ وقوع میں آنے والے واقعات کی باطنی کیفیات کا ذریعہ ادراک ہوتا ہے۔ ایسے وجدان سے زمانہِ حال میں پیش آنے والے واقعات مکانی و زمانی بلحاظ اِدراک کئے جاتے ہیں۔ اِنہی واقعات کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ وجدانی انکشافات کے ساتھ زمان کے لحاظ سے موجود اور مکان کے لحاظ سے غائب بھی ہوسکتے ہیں۔

وجدان کی اصطلاح سے فلسفہ میں یہ مفہوم بھی لیا جاتا ہے کہ وہ حس، تجربہ اور عقلی فہم سے بحیثیت ذرائع علم سبھی سے مختلف، معروض کا راست بلا واسطہ درک ہے۔

ولیم للّی نے وجدان کی تعریف یہ کی ہے:

An Intution is the immediate apprehension of an object by the mind without the intervention of any reasoning process.

ذہن کا کسی چیز کے بارے میں فوری ایسا ادراک جو عقلی دلائل کے بغیر حاصل ہوا ہو، وجدان کہلاتا ہے۔

اس نظریہ کے مطابق اخلاقیات کے جاننے کا ذریعہ انسان کا وجدان ہی ہوسکتا ہے جو بلا دلیل تسلیم کرے۔ اس لیے وجدانی نظریہ بلا دلیل تسلیم کیا جاتا ہے۔ جب ہم وجدان کے بارے میں دلائل دے رہے ہوں، تو اس کا واضح مطلب یہ ہے

کہ یہ وجدانی نظریہ نہیں رہا بلکہ عقلی نظریہ بن گیا ہے۔ لہٰذا جو حکماء مغرب وجدانیت کے دعویدار ہیں اور وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ وجدانی افعال معاشرے کے مفاد میں ہوتے ہیں تو درحقیقت وہ وجدانیت سے اسوقت رہنمائی نہیں لے رہے ہوتے۔

فکری دنیا وجدان کے متعلق یہ بھی نہیں بتا سکی کہ اس کی ماہیت کیا ہے۔ لیکن ہمارے دور کا وجدان کا سب سے بڑا موید برگسان اُسے ایک ارفع نوع فکر ہی قرار دیتا ہے۔ جو فکری ارتکاز یا ممارست کا غیر شعوری نتیجہ ہوتا ہے۔ برگسان کے مطابق عالم کا معلوم کی کہنہ، میں نفوذ کر جانے کا راست عمل ہے۔ برگسان کے مطابق حقیقت تغیر پذیر اور نا قابلِ تقسیم اکائی ہے۔ عقلِ اِنسانی سے اِس کا عِلم ممکن نہیں، بلکہ وجدان کے ذریعہ اِس حقیقتِ مطلقہ کا عرفان ہوسکتا ہے۔ عقل صِرف اُن حقائق سے تعلق رکھتی ہے جو غیر متحرک اور بسیط ہوں۔ عقل مادہ اور مادی صِفات کی دنیا میں عمل کرتی ہے، جبکہ حرکت، زندگی، تغیر اور آگہی وجدان یعنی بلند نوعِ فِکر کا میدان ہے۔

جدید دور کے فلسفیوں میں برگساں کو جو مقام اور اہمیت حاصل ہے، اِس کے حوالہ سے کہا جا سکتا ہے کہ بیسویں صدی کے افکار پر برگساں کے اثرات بہت پختہ ہیں۔ برگساں نے مادہ اور زندگی، جسم اور ذہن اور اِرادہ وقوتِ اِرادہ کے بارے میں بڑی وضاحت سے لکھا۔ برگساں نے اپنی Creative Evaluation تصنیف میں اپنے فِکری نظام سے یہ ثابت کیا کہ اِنسان کی زندگی محض مادی زندگی نہیں، بلکہ اِس کی زندگی کا سب سے اہم پہلو اُس کا ذاتی، داخلی اور وجدانی تجربہ ہے۔ وجدان کی تحریک نے اِس کو یقین دلا دیا تھا کہ زندگی میں اِس سے کچھ زیادہ ہے، جتنا کہ وہ پہلے ممکن سمجھا کرتا تھا۔ لہٰذا اُسے یقین ہو گیا تھا کہ ذہن کا معقول وظیفہ صِرف گنتی کرنا ہوتا ہے، تاہم وہ محسوس کرنے کے اہل نہیں۔

احساس کا تعلق ذہن کے وجدان پر ہوتا ہے۔ وجدان کو اگر دانائی سے بروئے کار لایا جائے، تو وہ ذہن کا معزز شعبہ بن کر سامنے اتا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ وجدان چیزوں کی حقیقت کا اِدراک کرنے کا واحد وسیلہ ہے۔ سائنس دان دعوٰی کرتے ہیں کہ ذہن بس دماغ ہی سے عبارت ہے۔ برگساں اِس کو جواب دیتا ہے کہ اگر ایسا ہی ہوتا تو پھر دماغ پر پہنچنے والا ہر گھاؤ سے حافظہ کو لازماً ضعف پہنچتا۔ اُس نے دیکھا ہے کہ ایسے مریض بھی ہوتے ہیں کہ جن کے دماغ کو کوئی چوٹ یا زخم نہ لگا تھا، مگر اُن کا حافظہ ضائع ہو گیا۔ برگساں کا نقطعہ نظر یہ ہے کہ جو قوت کسی ایک تجربہ کی کیفیت کی یاد کو تازہ کر سکتی ہے، اصل میں وہی قوت ہے، جو اشیاء کی کیفیت کو سمجھتی ہے۔ یہ خودی کی کیفیت ہے۔ خود اِنسان کو جو سب سے عظیم الشان شاہکار ہے، اُسے بھی دماغ کے ذریعہ نہیں سمجھا جا سکتا۔ اُسے صِرف وجدانی خودی ہی کے ذریعہ سے سمجھا جا سکتا ہے۔ برگساں کا دعوٰی ہے کہ حقیقت کا تعلق حِسی تجربہ سے ماوراء ہے۔ زندہ اور نمو پذیر روح کے حرکاتی پہلو کے طور پر اِس کی حقیقت کا انکشاف صِرف اِس کی وجدانی ذات کی تخلیقی عقل پر ہی ہوتا ہے۔ اِس نے یہ نظریہ ختم کر ڈالا تھا کہ ذہن اور دماغ ایک ہی شے کے دو مختلف نام ہیں۔ اِس کا دعوٰی تھا کہ ذہن دماغ سے کہیں بڑھ کر ہے۔ ذہن تخلیقی جبکہ دماغ میکانکی ہوتا ہے۔ صِرف تخلیقی ذہن ہی تجربہ کی سچائیوں کو سمجھ سکتا ہے، اِس کا سبب یہ ہے کہ تجربہ تخلیقی کُلیت ہوتا ہے۔ وہ ایسا مجموعہ ہے، جو اپنی اجزاء سے بڑھ کر ہے۔ وہ

ایسی کُلیت ہے، جس کو محض اِس کے اجزاء میں تحویل نہیں کیا جا سکتا۔ تحلیلی ذہن تو صرف زمانہِ حال مین عمل کر سکتا ہے، جبکہ تخلیقی ذہن خود میں ارتقاء کو سموئے ہوتا ہے اور اِس میں پورا ماضی، حال اور مستقبل شامل ہوتا ہے۔

قرآن سے وجدانی اِدراک کی وضاحت حضرت یوسف کی تَأْوِیلِ الْاَحَادِیْثِ کی شکل میں بیان کی ہوئی یوں ملتی ہے۔

وَ كَذٰلِكَ يَجْتَبِيْكَ رَبُّكَ وَيُعَلِّمُكَ مِنْ تَأْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ (6:12)

(باپ نے مزید کہا) تیرا رب تجھے کسی عظیم مقصد کے لیے منتخب کرے گا، اور تجھے ایسی فراست عطا کرے گا کہ تیری نگاہ معاملات کے انجام ونتائج تک فوراً پہنچ جائے گی۔

تاویل کے معانی ہیں، کسی بات کے انجام کو سامنے رکھنا، اور احادیث کے معانی ہیں واقعات یا باتیں جو سامنے پیش آئیں۔ روزمرہ کے واقعات ہم میں سے ہر ایک کے سامنے آتے ہیں، ایک شخص ان کو سرسری طور پر دیکھ کر آگے بڑھ جاتا ہے، دوسرا راسخون فِی العلم اُنہیں دیکھتا ہے تو کہتا ہے کہ یہ تو بڑی گہری بات ہے اور میری بصیرت بتا رہی ہے کہ یہ چیز کسی دن اس طرح سے ہوگی۔ یا ہم کہتے ہیں کہ مجھے تو اس کے عزائم یہ نظر آتے ہیں۔ یہ دوسرا شخص ذہنی طور پر بکھری ہوئی مختلف کڑیاں ملاتا ہے اور واقعہ یا حادثہ کی منتشر کڑیاں ملانے کے بعد وہ بات کی تہہ تک اس کے انجام تک پہنچتا ہے، اسے کہتے ہیں تاویل الاحادیث یعنی ''بات سے کڑیاں ملا کر انجام تک پہنچ جانا۔ یہی وجدان کا کردار بتایا جاتا ہے۔ تاویل الاحادیث کوئی غیبی یا باطنی شے نہیں ہے بلکہ یہ عقلِ انسانی یعنی وجدان ہی ایک لطیف شکل ہوتی ہے۔ یہ بصیرت کی انتہا ہوتی ہے، یہاں انسانی عمدہ عقل کا اظہار ہوتا ہے۔ ہم کبھی کبھی کہتے ہیں کہ مجھے یہ معلوم نہیں کہ فلاں بات میں نے کیسے کہی لیکن میرے ذہن میں کچھ ایسا ہی آیا اور میں نے کہہ دیا اور وہ بات واقعی ویسے ہی ہوگئی۔ انسان کسی فن یا کسی علم کے اندر اتنا جذب ہو جائے کہ ہر وقت اسی کا خیال رہے، تو یہ وجدان کی شکل میں لاشعور میں مرتسم ہو جاتا ہے، جو دراصل شعوری ذہن ہی کی صلاحیت ہوتی ہے لیکن وہ اُس سے پوشیدہ ہوتی ہے۔ ایسے ذہن کی حامل شخصیت حالات وواقعات پر غور کر کے لاشعور کی مدد سے بھی انجام تک پہنچ جایا کرتی ہے۔ انجام تک پہنچ جانے کو تاویل الاحادیث کہتے ہیں۔ عام شخص تو شعوری طور پر کڑیاں ملا کر نتیجے پر پہنچتا ہے، لیکن لطیف بصیرت کے حامل لوگ غیر شعوری طور پر کڑیاں ملا رہے ہوتے ہیں اور نفسِ شعور یہ کو پتہ ہی نہیں ہوتا کہ کڑیاں کس طرح مل رہی ہیں۔ لاشعور کڑیاں ملاتا ہے اور شعور ایک نتیجے کے اوپر پہنچ جاتا ہے۔ یہ وجدان، یا تاویل الاحادیث کہلاتی ہے۔

ایک واقعہ ہمارے سامنے آتا ہے ہم سرسری طور پر آگے بڑھ جاتے ہیں، وہی واقعہ جب ان لوگوں کے سامنے آتا ہے، جو فنِ سیاست میں جذب ہوئے ہوتے ہیں، تو وہ کہتے ہیں کہ نظر آتا ہے کہ روس اور چین کی جنگ ہونے والی ہے۔ ایسا کہنے والوں کے لاشعور کے سامنے کڑیاں ہوتی ہیں، جنہیں ملانے سے وہ جنگ کے نتیجے پر پہنچتے ہیں۔ یہ کوئی علم غیب، کی یا مافوق الفطرت بات نہیں ہوتی۔ ہم سمجھتے ہیں کہ قرآن نے یہ خوابوں کی تعبیر بیان کرنے کی بات لاشعور کی کڑیاں ملانے کے ضِمن میں کہی ہے۔

علامہ اقبال نے تاویل الاحادیث کے مفہوم کی وضاحت میں اپنے مخصوص انداز میں کہا ہے کہ:

واقعہ جو ابھی زیرِ افلاک میں ہے:

عکس اس کا میرے آئینۂ ادراک میں ہے ادراک کے معنی شعور، فہم اور عقل ہوتی ہے کہ یہ ساری بات جو میں واقعہ کے رونما پذیر ہونے سے قبل نتیجہ بیان کرنے میں کہہ رہا ہوں، یہ کوئی روحانیت، کشف اور کرامات کی بات نہیں بلکہ آئینہ اِدراک کی ہے۔ آئینۂ ادراک اتنا مصفا ہو جاتا ہے کہ ایک واقعہ سامنے آتا ہے، تو وہ اس کی کڑیاں ملاتا چلا جاتا ہے اور کسی نتیجے پہ پہنچتا ہے۔ بالعموم وہ نتیجہ صحیح نکل آتا ہے۔

قرآن میں ہے کہ حضرت یوسف کے آئینۂ ادراک وجدان نے یعنی تاویل الاحادیث نے قحط سے بچنے کی تدبیر بتائی کہ یوں کیا جائے تو قحط کی سختیوں سے بچا جا سکتا ہے۔ حضرت یعقوب نے بھی یوسفؑ کا خواب سن کر، بیٹے کے اخلاق و اطوار سامنے رکھتے ہوئے تاویل الحادیث کی رو سے کہہ دیا تھا کہ ''تیرا رب تجھے کسی عظیم مقصد کے لیے منتخب کرے گا، اور تجھے ایسی فراست عطا کرے گا کہ تیری نگاہ معاملات کے انجام و نتائج تک فوراً پہنچ جائے گی۔

مغربی مفکر لاک نے وجدان کے جِبلت ہونے کے عِلمی امکان پر بھی تنقید کرتے ہوئے کہا کہ اس طرح کا کوئی علم حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس نے کہا کہ اگر یہ تصدیقات جبلی یا وجدانی ہیں اور تجربے سے ماوراہیں تو پھر انہیں انسانی ذہن میں یکساں طور پر ہونا چاہیے تھا۔ مگر ایسا کوئی تصور نہیں جو آفاقی طور پر تمام اذہان میں پایا جاتا ہو۔ اُسکا کہنا ہے کہ کسی چیز کا کسی ذہن میں ہونا دراصل اسی چیز کے معلوم ہونے کے ہم معنی ہے۔ لہٰذا یہ کہنا کہ وجدانی تصورات کی شکل میں ذہنوں میں لاشعوری طور پر معلوم ہوتے ہیں۔ دراصل متضاد بالذاتہے۔ وجدانی تصورات ذہن میں ہوتے نہیں، بلکہ شعور و لاشعور کی مدد سے بنائے جاتے ہیں۔ لاک ہی کے مطابق ہر فرد کا ذہن پیدائش کے وقت ایک سادہ اور صاف سلیٹ کی مانند ہوتا ہے۔ یا وہ کاغذ کا سادہ ورق ہوتا ہے جس پر کچھ بھی تحریر یا منقش نہیں ہوتا۔ ماحول اور تجربے کے بعد انسانی ذہن میں تصورات وغیرہ پیدا ہوتے ہیں۔

ہیوم نے بھی یہ موقف لیا ہے کہ وجدان بہرحال ایسی چیز تو ہے ہی نہیں کہ جانچی اور پرکھی جا سکے۔ یہی وجہ ہے کہ وجدانیت کے حکماء عِلم نہ ہونے کی وجہ سے انسانی زندگی گزارنے کے لیے کسی قسم کا لائحہ عمل نہیں دے پائے۔

عِلم کے حصول کے غیر استدلالی ذرائع اور خصوصی طور روجدان کے بلند نوعِ فِکر کا مُختصر جائزہ لینے کے بعد اب ہم عِلمِ استدلالی کا قدرے تفصیل سے جائزہ لیں گے۔

علمِ استدلالی کے موقف کی وضاحت

علم کی تعریف یہ کہہ کر بھی کی جاتی ہے کہ یہ ایک ایسا نشان ہوتا ہے کہ جس سے کسی شے کی اصل حقیقت کا ادراک ایسا ہو کہ وہ پہچانی جا سکے اور دیگر اشیاء سے متمیّز ہو سکے۔ یہ اِس لیے کہ کسی چیز کی تمیز اُس کی ذات کی اصل حقیقت کا ادراک کرنے سے ہی ہوتی ہے۔

اب ہمارے لیے علم کا۔ مسئلہ یہ ہے کہ اصل حقیقت کا اِدراک کیسے کیا جائے؟ علم استدلالی کا موقف ہے کہ اس کے لیے اپنے موقف کے حق میں مؤثر دلائل پیش کئے جائیں۔ ابھی ہم نے دیکھا ہے کہ مؤثر دلائل کے ذریعہ کی غیر موجودگی میں علم غیر استدلالی سے کسی کی اصل حقیقت کی فہم کوئی کردار نہیں ہوتا ہے۔ ہماری یہ عقل بتاتی ہے کہ کائنات کی ہر شے کا وجود علت و معلول کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے اور انکی حقیقت کے فہم کا اِدراک صرف عقلِ اِنسانی ہی دریافت کرسکتی ہے۔ اِس پر سب ہی متفق ہیں کہ علمِ استدلال میں ایسی مؤثر دلیل دی جاتی ہے کہ جو ہر حال میں سچی، واضح اور ظاہر ہو۔ قرآن کریم نے اپنی طرف سے پیش کی جانے والے دلائل کے لیے بُرہان کا لفظ استعمال کر کے وضاحت کی ہے کہ:

بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ (4:174)

''تمہارے رب کی طرف سے واضح دلیل ہے۔''

اس لیے کہ قرآن کا ہر دعوٰی دلیل اور برھان پر مبنی ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ علانیہ مخالفین سے مطالبہ کرتا ہے کہ:

قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (2:111)

اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو، تو اس کی تائید میں کوئی دلیل (برھان) پیش کرو۔

قرآن کو اپنے دعوے کی صداقت اور صداقت پیشہ کرنے کی وحدانیت پر اس قدر یقین ہے کہ اپنے اس مطالبہ کے ساتھ ہی دوسرے زرائع کے بارے میں کہہ دیا کہ:

لَا بُرْهَانَ لَهٗ بِهٖ (23:117)

''کسی کے پاس (مُطلق الحق کے ثبوت میں) برہان نہیں ہے۔''

امام راغب نے دلیل کی پانچ صورتوں میں تقسیم کر کے تصریح کی ہے کہ:

1۔ وہ ہمیشہ صدق کی متقاضی ہوتی ہے۔ 2۔ وہ ہمیشہ کذب کی متقاضی ہوتی ہے۔

3۔ وہ اقرب الی الصدق ہوتی ہے۔ 4۔ وہ کذب کے قریب تر ہوتی ہے۔

5۔ وہ صدق و کذب میں مساوی ہوتی ہے۔

حُکماء نے علمِ استدلالی کو درجِ ذیل دو اہم شاخوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

1۔ نظریہ تجربیت 2۔ نظریہ تصوریت

مادی نظریہ حیات میں دنیاوی زندگی کو ہی اِنسانی زندگی کی انتہا سمجھا جاتا ہے، جس میں مرئی طور پر حواس کے ذریعہ تجربی واقعات کو ہی علم کا مآخذ گردانا جاتا ہے اور غیر مرئی تصوراتی علم کا انکار کیا جاتا ہے۔ اِس کے برعکس نظریہ تصوریت میں واقعات کے دونوں مرئی و غیر مرئی کے مقاصد کی تلاش کرتے ہوئے اُنہیں علم کے درجہ میں شمار کیا جاتا ہے۔ یہاں پہلے ہم علمِ استدلالی کے نظریہ تجربیت سے بحث کا آغاز کر رہے ہیں اور بعد میں نظریہ تصوریت کو زیرِ بحث لایا جائے گا۔

پمفلٹس --- PAMPHLETS

ادارہ طلوع اسلام دینی موضوعات پر پمفلٹس شائع کرتا رہتا ہے

فی پمفلٹ قیمت 20 روپے علاوہ ڈاک خرچ

اسلام آگے کیوں نہ چلا	قرآن مجید کے خلاف گہری سازش	دوقومی نظریہ
اسلام کیا ہے؟	قربانی	عورت قرآن کے آئینے میں
اسلام ہی کیوں سچا دین ہے؟	قیامت موجود	پاکستان کی نئی ''زیارت گاہیں''
اسلام اور مذہبی رواداری	قوموں کی تعمیر فکر سے ہوتی ہے ہنگاموں سے نہیں!	کیا تمام مذاہب یکساں ہیں؟
کیا اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے؟	قوموں کے تمدن پر جنسیات کا اثر	تحقیق ربٰو (مسئلہ سود)
اسلامی قانون کی اصل و بنیاد کیا ہے؟ (مغربی پاکستان ہائیکورٹ کا فیصلہ)	ہماری نمازیں اور روزے بے نتیجہ کیوں ہیں؟	کیا قائداعظمؒ پاکستان کو سیکولر سٹیٹ بنانا چاہتے تھے؟
اسلامی آئیڈیالوجی	ہندو کیا ہے؟	بنیادی حقوق انسانیت اور قرآن
اسلام اور پاکستان کے خلاف گہری سازش (20 روپے علاوہ ڈاک خرچ)	ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ (قرآنی اصطلاحات کی تشریح)	تکذیب دین کون کرتا ہے اور مصلّی کسے کہتے ہیں
اسلامی مملکت کے سربراہ کی معاشی ذمہ داریاں	ہماری تاریخ میں کیا ہے؟	روٹی کا مسئلہ
اسلامی قانون سازی کا فریضہ (بال سے باریک تلوار سے تیز)	ہم میں کیریکٹر کیوں نہیں؟	جو ہو ذوق یقین پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
انسانیت کا آخری سہارا	ہم عید کیوں مناتے ہیں؟	نماز کی اہمیت
اے کشتۂ سلطانی و ملائی و پیری	مقام اقبالؒ	ضبطِ ولادت (خاندانی منصوبہ بندی)
اقبال کا مردِ مومن	مقام محمدی ﷺ	علماء کون ہیں؟
اندھے کی لکڑی	مرزائیت اور طلوع اسلام	فرقے کیسے مٹ سکتے ہیں
آرٹ اور اسلام	ماؤزے تنگ اور قرآن	کافرگری
قرآن کا معاشی نظام	مومن کی زندگی	حرام کی کمائی
قرآن کا سیاسی نظام	جہاں مارکس ناکام رہ گیا	عالمگیر افسانے

اہم نوٹ: پی ٹی سی ایل کے لینڈ لائن نمبر صرف دفتری اوقات کے لیے ہیں۔ لینڈ لائن رابطہ نمبر خراب ہونے کی صورت میں یا چھٹی کے دن/وقت آپ سیل فون نمبر پر ٹیکسٹ/ وٹس ایپ میسیج کر سکتے ہیں۔
آپ سے درخواست ہے کہ اپنا مدعا تفصیلی طور پر ایک ہی میسیج میں لکھ دیجئے۔ شکریہ

ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) 25-بی، گلبرگ 2، لاہور فون نمبرز: +92 42 3571 4546, +92 310 4800 818
+92 318 4271 465, +92 331 4763 936

PUBLISHED SINCE 1938 AT THE BEHEST OF ALLAMA IQBAL[R] AND QUAID-E-AZAM[R]

CPL.NO. 28
VOL.76
ISSUE
11

Monthly

TOLU-E-ISLAM

25-B, Gulberg 2, Lahore, Pakistan
Phone. 042-35714546, 042-35753666
E-mail:idarati@gmail.com Web: www.toluislam.org
www.facebook.com/idaratolueislam1/ www.youtube.com/idaratolueislam

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

